جلد ۹۵ مئی ۱۹۸۱ء عدد ۳

ماہنامہ

ترجمان القرآن

مؤسس

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ تعالیٰ

ادارہ ترجمان القرآن اچھرہ لاہور

ضروری اعلان

ادارہ ترجمان القرآن نے رمضان المبارک کے مقدس مہینہ میں مندرجہ ذیل
کتابوں پر خصوصی رعایت دینے کا فیصلہ کیا ہے

پارہ اوّل تفہیم القرآن	۶/۵۰	روپے
سورۃ الفاتحہ	۹/-	"
سورۃ النساء	۶/۲۵	"
سورۃ الفرقان	۳/-	"
سورۃ العنکبوت	۳/۵۰	"
سورۃ الاحزاب	۶/۵۰	"
سورۃ یٰسٓ	۳/-	"
سورۃ الفتح	۳/-	"
سورۃ الحجرات	۳/-	"
سورۃ الرحمٰن	۳/-	"
سورۃ لقمان	۳/-	"
تیسواں پارہ	۲۰/-	"
میزان	۶۹/۷۵	روپے
رعایتی قیمت	۴۵/-	روپے

بنیادی حقوق	DELUX	قیمت	۲۷/- روپے	رعایتی قیمت	۱۶/- روپے
بنیادی حقوق	P.B	"	۲۰/-	"	۱۲/- "

ادارہ ترجمان القرآن — ۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ - لاہور

ترجمان القرآن لاہور

فہرست

جلد ۹۵	مئی ۱۹۸۱ء مطابق رجب ۱۴۰۱ھ	عدد ۳

ماہنامہ ترجمان القرآن لاہور

۵-اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

زرِ سالانہ تیس روپے - فی پرچہ ۳/- روپے

فون نمبر ———— ۴۱۰۳۱۶

سید حسین فاروق مودودی پبلشر نے ایچ فاروق ایسوسی ایٹس لمیٹڈ سے چھپوا کر دفتر ترجمان القرآن اچھرہ لاہور سے شائع کیا

پرنٹر: سید حسین فاروق مودودی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جدید مغربی فلسفۂ جرم و سزا کا نشوونما ایک خاص نظریاتی فریم میں ہوا ہے۔

اس کی بنیادوں میں اوّلین تصوّر یہ کام کر رہا ہے کہ بے خدا مادّی کائنات میں انسان کی پیدائش حیوانات کے خاندان میں چند اتفاقات کی ہم آہنگی سے ہوئی ہے۔ وہ نہ کسی صاحبِ ارادہ و حکمت خالق کی مخلوق ہے، نہ وہ ایک روحانی و اخلاقی وجود ہے جس پر خلافت کی ذمہ داریاں عاید ہوں، اور نہ وہ اپنے اعمال و افعال میں کسی بالاتر قوت کے سامنے جوابدہ ہے۔

جس تصوّرِ تاریخ میں انسان کو رکھ کر دیکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پہلے قبل تاریخ کے دَورِ تاریکی میں تھا۔ اور جنگلی جانوروں کی سی زندگی سے اُس نے اپنے دَور کا آغاز کیا[1] پھر مل جل کر رہنے کی وجہ سے اس میں مدنیت کا جب آغاز ہوا تو اُس نے کچھ ایسی تکلیف دہ اور ناخوشگوار

---

[1] ہمارا تصوّرِ تاریخ بالکل مختلف ہے۔ دُنیا کا پہلا انسان خدائی ہدایت ساتھ لے کر آیا۔ پھر جب جب یہ ہدایت ضائع ہوئی یا دھندلا گئی یا مسخ ہو گئی تو بعد میں بار بار انبیاء اس کی تجدید کے لیے مبعوث ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ نبی آخرالزماں تک پہنچا۔ یعنی ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "انسانی زندگی کا آغاز اخلاقی شعور اور الٰہی ضابطۂ ہدایت یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے ساتھ ہوا۔ بعد کی ساری تاریخ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ وحشت اور غلاظت اور تاریکی کا تعلق جاہلیت سے ہے۔ خواہ یہ جاہلیت کتنی ہی عالمانہ اور عقلی ہو اور جدید ہو۔

چیزوں کو جرم قرار دے لیا جسے مجموعی طور پر کسی مدنی یونٹ کے سارے شرکاء روکنا چاہتے تھے۔ ایسے جرائم کے لیے اپنے نیم مدنی، نیم وحشیانہ دور کے مطابق بہت ہی غیر شائستہ قسم کی سزائیں مقرر کیں۔ جیسی کہ بعض دور افتادہ علاقوں کے تہذیب نا آشنا قبائل میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ اس دور کے سلسلۂ جرم و سزا پہ بالعموم مذہب یا دیوتاؤں کا لیبل لگا دیا گیا۔ اور آبا پرستی کے تحت ان میں ایسا تقدس پیدا کر لیا گیا کہ عقلی طور پر اس معاملے میں غور و فکر سے کام لینے کی کسی میں مجال ہی نہ تھی۔ اب جو روشن دورِ عقل اہل مغرب کی قیادت میں نمودار ہوا ہے اس نے از سرِ نو جرم و سزا کے نظریات کو عقلی طور پر مدون کر کے قانون کو شائستگی کی سطح تک پہنچا دیا ہے۔

جرم کی تشخیص اور سزا کی تعیین میں دورِ جدید کے جمہوری نظام نے شارع کا مرتبہ اصولاً عوام کو اور عملاً نمائندہ ایوانوں کی حکمران اکثریتی پارٹیوں کو دے دیا ہے۔ کوئی جرم، جرم ہے یا نہیں، ہے تو کس درجے کا ہے، جس بھی درجے کا ہے اس کے مطابق کیا سزا دی جانی چاہیے، اس کا فیصلہ رائے عام کے مطابق حکمران پارٹی جمہوری ایوان میں کرتی ہے۔ نئے دور کی یہ شارع قوت جب چاہے کسی جرم کو کارِ خیر قرار دے، جب چاہے کسی سزا کو ناروا ٹھہرا دے۔

یورپ میں یوں تو ایسی بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مگر چند نمایاں مثالیں قابلِ توجہ ہیں۔ زنا بالرضا کو دورِ نو کی عقلیت نے جائز ٹھہرایا۔ اور اب کوئی مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرے تو وہ تو مجرم ہے، لیکن اگر وہ بغیر کسی جبر کے دسیوں عورتوں کی آبرو سے کھیلتا رہے تو یہ حلال طیب ہے۔ بلوغت کی مقررہ عمر سے قبل شادی کرنا قانوناً ممنوع ہے، لیکن شادی کیے بغیر شادی والے تعلقات کا ذوّاقین اور ذوّاقات میں قائم ہوتے رہنا مباح ہے۔ ایک دردناک مثال یہ ہے کہ عملِ قومِ سدوم جو مغرب میں بھی شروع سے ممنوع چلا آرہا تھا، اب اکثر مہذب ترین ممالک میں جائز تعلق قرار دیا گیا ہے، بلکہ علانیہ ایک ہی جنس کے زوجین باقاعدہ یکجائی ازدواجی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور شادی کا ڈراما بھی رچاتے ہیں۔ ایسا ہی سزاؤں کے معاملے میں ہوا ہے۔ کچھ لیڈروں اور پروپیگنڈے کے اداروں اور انتخاب جیتنے کے لیے سیاسی پارٹیوں نے یہ نقطۂ نظر پھیلانا شروع کیا کہ کسی مجرم (خواہ وہ قتل کر چکا ہو) کو سزائے موت دینا ایک وحشیانہ حرکت ہے، لہٰذا اسے قانوناً ختم ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ برطانیہ، امریکہ اور بعض دوسرے "مہذب" معاشروں میں سزائے موت ختم کر دی گئی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اعداد و شمار

کے مطابق قتل اور دوسرے سنگین جرائم میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا ہے۔ چنانچہ ایک بار پھر آواز اُٹھ رہی ہے کہ سزائے موت کو بحال کر دینا چاہیے۔ اور تو اور، امریکہ کے نئے صدر ریگن صاحب نے بھی سینے میں گولی کھانے اور قبر کے کنارے سے لوٹنے کے بعد بیان دیا ہے کہ سزائے موت ضروری ہے۔

جدید فلسفۂ جرم و سزا کا چوتھا عطیہ یہ ہے کہ جرم کا نشانہ بننے والوں کی مصیبتوں سے قطع نظر کر کے مجرم کے لیے ہمدردی کے جذبات کارفرما ہو گئے ہیں۔ مغربی فلسفی، مصنّفین، مقنّنین، سیاسی اکابر اور جج اور وکلا سب کے سب اپنے دلائل اور جذبات کا وزن مجرم کے پلڑے میں ڈالتے ہیں۔ دَورِ جدید کے علم "مجرمانہ انسانی فعلیات" (CRIMINAL ANTHROPOLOGY) میں سب سے پہلے نمایاں طور پر ہمدردیٔ مجرم کا عنصر ایک شخص (LOMBROSO) نے داخل کیا۔

انسان کے حیوانی تصوّر پر مبنی اس مادہ پرستانہ اور جمہوری تصوّرِ جرم و سزا کی جڑیں ایسے بیشتر ذہنوں میں اُتری ہوتی ہیں ــــــ شاید ان کا پورا شعور بھی اُن کو نہ ہو ــــــ جو متعدد اسلامی ممالک میں قانون کی ڈگریاں حاصل کر کے عدالت و وکالت کی ذمہ داریاں اُٹھائے ہوتے ہیں۔ اور اُن کی پشت پر ماڈرن ازم کے قتیلانِ ناز کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے۔ اس طبقے کے اذہان اگر قدرے محبِ اسلام بھی ہوں تو بھی وہ جب جرم و سزا کے مسائل پر سوچتے ہیں تو "شائستگی" کے خلافِ اسلام تصوّر کو کسوٹی بنا کر اس پر قرآن و سنّت کی سزاؤں کو پرکھتے ہیں۔ اور جو چیز اس تصوّرِ شائستگی کے خلاف نظر آئے اُسے دین سے خارج رکھنا چاہتے ہیں۔ بعض ایسے شائستگی پرست اصحاب نے قرآن میں جب چوری کی سزا قطع ید دیکھی تو لغت اور محاورے اور سنّت اور معمولِ اُمّت سب کو بالائے طاق رکھ کر حکم لگا دیا کہ قطعِ ید سے یہاں مراد چور کے ہاتھوں کو چوری کرنے سے روک دینا ہے۔ آپ نے اُسے جیل میں ڈال دیا تو قطعِ ید ہو گیا۔ یا آپ نے توبہ کرا کے اس کے معاشی مسئلے کو حل کرنے کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا تو بھی قطعِ ید ہو گیا۔ قرآن کی زبان اتنی عامیانہ اور سطحی کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ قطعِ ید کہے تو اس کے معنی کسی آلے سے چور کا ہاتھ کاٹ دینا ہوں۔ پھر قرآن سے ایسی ناشائستگی کی توقع نہیں لگائی جا سکتی۔ اس عنصر کا کہنا یہ ہے کہ

حضورؐ کے جو اقوال و افعال قطعِ ید کے سیدھے سادے غیر پُراسرار مفہوم کی تائید کرتے ہیں وہ حضورؐ جیسے حکیم اور شفیق انسان کے اقوال و افعال ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسی چیزیں تو عجمی سازش کے تحت گھڑ گھڑ کر لوگوں نے دفتر جمع کر دیئے۔ تاریخ اگر ایسی گواہی دیتی ہے تو قرآن کے مقابلے میں تاریخ کی کیا حیثیت ہے جب کہ قرآن اپنے آپ کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی امداد کا محتاج نہیں[1]۔ قرآن میں استعمال شدہ الفاظ "قطعِ ید" کے صحیح معنی وہ ہیں جو ہم نے بتائے ہیں اور یہ حق ہر دَور کے لوگوں بلکہ ہر شخص کو پہنچتا ہے کہ وہ قرآنی الفاظ و عبارات کا مفہوم متعین کرے۔ اگر خدا کے رسولؐ نے اُن کا کوئی مفہوم متعین کیا بھی تھا تو وہ اسی خاص دَور کے لیے تھا۔ ہم سے کیا مطلب؟ اُس دَور کے لوگ رسولؐ کی تفسیر و تشریح کے محتاج ہوں گے۔ ہم ضرورت مند نہیں ہیں۔ ہم تو اپنی مرضی سے اجتہاد کریں گے۔ یہی چیز سزائے رجم کو شریعت سے خارج قرار دینے کی بھی محرک بنی۔

دیکھیے ذہنوں کے اندر اترے ہوئے مغربی تصوراتِ جرم و سزا اور معیاراتِ شائستگی معاملے کو کہاں سے کہاں لے گئے۔

میں چونکہ اس وقت مسئلے کو عقلِ عام کی روشنی میں لانا چاہتا ہوں، اس وجہ سے پہلے میں جُرم کی شناعت کے چند پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

کسی خاتون کی عصمت جب لوٹی جاتی ہے تو اس کے بے شمار اثرات ہوتے ہیں:-

۱- ایسا حادثہ اس کی نسائی خودی کا قاتل ہوتا ہے۔ اُس کی حیا تباہ ہو جاتی ہے، جو گناہ اور بُرائی روکنے والی مؤثر داخلی قوت ہے۔

۲- اگر وہ کنواری ہو تو اس کا ازدواجی مستقبل تباہ ہو سکتا ہے اور اس کے ماں باپ اور بہن بھائی ذلت کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس کے بہن بھائیوں کے لیے بھی رشتے بند ہو جائیں اور اُن میں سے جو شادی شدہ ہوں وہ سسرالی گھرانوں میں بے وقعت ہو جائیں۔ اس کی کسی بہن کو

---

[1] غالباً لغت اور گرامر کی قید سے بھی قرآن کو آزاد رکھنا چاہیے۔

اس کا ہنستا بستا گھر سے نکال بھی سکتا ہے۔ کم سے کم ساری عمر طعنوں کا سلسلہ تو اُسے جراحتیں لگاتا رہے گا۔

۳۔ خاندان یا محلے میں ایسے حادثے کا چرچا یا معاشرے میں اُس کا شہرہ خود مظلومہ کے لیے تکلیف دہ ہونے کے علاوہ کئی دوسرے غیر سلیم الفطرت نوجوانوں میں بدکاری کے مجرمانہ رجحانات پیدا کر سکتا ہے۔

۴۔ اگر وہ شادی شدہ ہو تو اُس کا شوہر اُسے طلاق بھی دے سکتا ہے۔ اُسے معلّقہ بنا کے بھی رکھ سکتا ہے یا اُسے مستقلاً نشانۂ طعن و تشنیع بنا سکتا ہے۔

۵۔ اگر اُس کے بچے ہوں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ گزرے ہوئے کسی حادثے کی وجہ سے وہ بھی بُرائی کے تصورات کی لذت لیتے لیتے خود بھی جرم کی راہ پر پڑ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے طعنے سنیں یا اپنے ہی اندر کے احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن میں معاشرے کے خلاف انتقامی جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ آہستہ آہستہ خطرناک مجرم بن جائیں۔

۶۔ مغرب کے جدید غیر اسلامی تصورات کے مطابق جو لوگ زنا بالرضا کو کچھ مختلف نوعیت دیتے ہیں وہ اگر سوچیں تو انھیں اندازہ ہو گا کہ اُوپر بیان کردہ بیشتر خرابیوں کا ظہور اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ مخالفتِ ضمیر، خیانتِ شوہر اور بدلحاظیٔ اولاد کے پہلو بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

۷۔ مرد کے لیے بھی زنا اُس کے ذہن و ضمیر کو بگاڑنے، اچھے خاندانوں سے حصولِ رشتہ کا دروازہ بند کرنے، اس کے ازدواجی حالات کو خراب کرنے، والدین اور بہن بھائیوں اور خاندان کے حلقوں میں اُسے ذلیل بنانے اور معاشرے کے لیے اُسے ذریعۂ اشاعتِ فحش بنانے کے لحاظ سے بہت بڑے اثراتِ بد رکھتا ہے۔

۸۔ یہ ایسا جرم ہے کہ اس کے نتیجے میں بسا اوقات خودکشی کے حادثات بھی ہوتے ہیں اور ان حادثات سے مزید بُرے سماجی اثرات نمودار ہوتے ہیں۔

ایسا فعلِ شنیع جس کے نتائج اگرچہ متعلقہ افراد، خصوصاً عورت کو زیادہ ملتے ہیں، مگر ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اس پر کیا اور کیسی سزا ہونی چاہیے، یہ اس جرم کے متاثرین سے پوچھیے۔ بلکہ میں ذرا سی گستاخی کر کے یہ کہوں گا کہ عبرت مند لوگ چاہے اسی خیال کے ہوں یا اس طرزِ فکر کے (عیاذاً باللہ) کہ سے کسی کو ایسی آزمائش پیش آئے) اگر کسی کی ماں بہن، بیوی یا بیٹی

کے خلاف ایسا کوئی حادثہ ہو جائے تو یہ کسی متعلقہ شخص کو دیوانہ بنا سکتا ہے، اور پھر اگر اس کے جذبات قانون کے فیصلے کا انتظار نہ کریں تو بس چلنے کی صورت میں وہ جو سزا دے گا اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ قانونی سزا کے غیر متناسب ہونے کا ردّ عمل بھی خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے

ہمارے معاشرے میں جہاں اس جرم کی مثالیں عام ہیں، وہاں بحالتِ اشتعال اس جرم کی خوفناک سزائیں دینے کی مثالیں بھی بکثرت ہیں۔ بحالتِ اشتعال کیا۔ بہت سے لوگ تو مدتِ دراز کے بعد بدلے لیتے ہیں اور بسا اوقات انتقام در انتقام کا چکر چلتا ہے۔ اور انگریزی قانون جو یہاں اس سلسلے میں رائج رہا ہے۔ وہ اس جرم کی زد میں آنے والی خواتین اور خاندانوں کو اطمینان و اعتماد نہیں دلا سکا اور نہ معاشرے نے کبھی اسے انصاف سمجھا ہے۔ میرے ان جملوں کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ شہریوں کو قانون ہاتھ میں لینا چاہیے۔ بلکہ میرا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے لوگ عام طور پر اپنے فطری داعیات کے تحت ایسے جرم پر موت کی سزا دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی اخبارات میں آتے رہتے ہیں کہ انتقام لینے والوں نے محض کسی کو مار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے اعضا کاٹے ہیں اور بوٹیاں الگ کر دی ہیں۔

ایسی مثالیں ایشیاء اور افریقہ ہی میں نہیں، متعدد بہت یورپی ممالک میں بھی ملتی ہیں، جہاں انسانی فطرت کو ملحدانہ علوم اور پروپیگنڈے کے ذریعے مسخ کر دیا گیا ہے۔

انسانی معاشروں کے ان حالات کو سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رجم ہی اس جرمِ شنیع پر کم سے کم انتہائی درجے کی معقول سزا ہے جس میں جان لینے کے علاوہ مجرم کو نشانۂ بیزاری بھی بنایا جاتا ہے۔ اس سے کم تر سزا دینے سے ایک طرف جرم کو فروغ ہوگا، دوسری طرف جرم کی لپیٹ میں آنے والے فرد اور اس کے اعزہ و اقربا کے شدید ردّ عمل کی آگ .... بجھ نہ سکے گی نیز جرم و سزا میں تناسب نہ ہونے کی وجہ سے متاثرین اور عام معاشرے میں انصاف کا حق ادا ہونے کا احساس نہیں ہوگا[1]

---

[1] دورِ حاضر کے لیے بنتھم نے جو افادی نظریۂ قانون سازی مرتب کیا ہے اس کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

آپ یہ سوال اُٹھا سکتے ہیں کہ ہماری گفتگو کا زیادہ تر رُخ مجرم مرد کی طرف رہا ہے، مجرم عورت کی طرف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بالعموم اغوا کرنے والا مرد ہوتا ہے اور عورت اس کے جال میں پھنستی ہے۔ ناموس پہ حملہ کرنے والا مرد ہوتا ہے۔ عورت اس طرح حملہ آور نہیں ہوتی۔ پس کثیر صورتوں میں عورت بے گناہ ہو سکتی ہے۔ اور سارا جرم مرد کے حصّے میں جاتا ہے۔ لیکن "بالرضا" والی صورت میں (بسبب کہ عورت کو اکراہ یا خوف یا کسی اسکینڈل کے ڈراوے یا فریب یا بیہوشی یا اور کسی پیچیدہ صورت میں مبتلا نہ کیا گیا ہو) عورت بھی برابر کی مجرم ہوگی اور برابر کی سزا پائے گی۔

دوسرا سوال آپ یہ کر سکتے ہیں کہ آخر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزاؤں میں فرق کیوں ہے؟

یہاں اختلافِ احوال کے لحاظ سے مجرم کو اس کی مجبوری یا کمزوری کا الاؤنس دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجرم سے جائز طور پر جو ہمدردی کی جا سکتی ہے یا رعایت برتی جا سکتی ہے، شریعت اُسے ملحوظ رکھتی ہے۔ مثلاً عورت کے متعلق سہ گونہ مدارجِ حد یہ ہیں:-

ا۔ شادی شدہ فتیات (غیر آزاد اور غیر خاندانی عورتیں) = ۵۰ کوڑے

ب۔ غیر شادی شدہ محصنات (آزاد خاندانی عورتیں) = ۱۰۰ کوڑے

ج۔ شادی شدہ آزاد خاندانی عورتیں = رجم (سزائے موت بشمول تذلیل)

پہلی صورت میں مجرمہ کو ایک کمزور صورتِ احصان حاصل ہے، لہٰذا سزا بالکل کم (نمبر ۲ سے آدھی) دوسری صورت میں چونکہ خاندانی عورت کو خاندان کی وجہ سے خاص مضبوط صورتِ (باقی بر صفحہ ۴۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رُو سے جرم کرنے والے کو جُرم کے فائدے یا لذّت کے ساتھ سزا سے بچ نکلنے کا جو امکان نظر آتا ہے۔ اس کے بالمقابل اگر جُرم کی نوعیت کے مطابق قانون دوسرے پلڑے میں مناسب درجے کی سخت سزا نہ رکھے تو اس صورت میں جرم بڑھے گا اور مجرم جری ہوں گے اور ایسے ہی وجوہ ہیں کہ مغرب کا نظریہ جُرم و سزا، جرائم میں کمی کے بجائے اضافے کا باعث بن گیا ہے اور کسی نظامِ تہذیب کے تحت جرائم کا بڑھنا (دوسرے حالات سے قطعِ نظر) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نظریۂ جرم و سزا کی ساخت درست نہیں ہے۔

رجم یقیناً ایک حد شرعی ہے

جناب ملک غلام علی صاحب مدیر شعبہ علمیہ منصورہ
سابق معاون خصوصی مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی مغفورؒ

روزنامہ پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۷ مارچ ۱۹۸۱ء میں سابق چیف جسٹس مسٹر محمد یعقوب علی صاحب کا ایک مضمون "کیا رجم ایک اسلامی سزا ہے؟" کے زیر عنوان چھپا ہے۔ اس میں سب سے پہلے رسالہ "نیوز ویک" کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ ایران کی ایک شرعی عدالت کے فیصلے کے مطابق چار افراد پر رجم یعنی سنگساری کی حد جاری ہوئی ہے۔ اور اسی رسالے کا یہ تبصرہ بھی مضمون میں نقل کیا گیا ہے کہ "اسلامی قانون میں فوجداری سزائیں بہت سخت ہیں۔ مثلاً شرابی کو کوڑے مارے جاتے ہیں، چور کا ہاتھ کاٹ دیا جاتا ہے اور زنا کی سزا رجم ہے۔ وہاں کے مقامی افسروں نے اس وحشی پن کے لیے کوئی معذرت پیش نہیں کی۔ اور جب پوچھا گیا کہ اس سے پہلے ایران کی انقلابی عدالتوں نے رجم کی سزا کیوں نہیں دی تو جواب یہ دیا گیا کہ پہلے اسلامی قوانین کا صحیح اتباع نہیں ہو سکا۔"

توقع تو یہ تھی کہ پاکستان کی سب سے بڑی عدالت کے فاضل جج نے اگر ایک جاہل اور دشمن اسلام کی یاوہ گوئی کو نقل کر ہی دیا ہے تو وہ اس کی پوری نہیں تو جزوی تردید ہی کی ضرورت محسوس کریں گے کیونکہ اس بدباطن نے نہ صرف رجم کو بلکہ دوسری اسلامی سزاؤں کو جن میں شراب نوشی اور چوری کی سزا بھی شامل ہے، سب کو اپنی دریدہ دہنی کا ہدف بنایا ہے۔ لیکن جج صاحب نے جواب میں کہا تو یہ کہا کہ اسلام سے پہلے ایسی ظالمانہ و وحشیانہ سزائیں رائج تھیں لیکن اسلام نے اس صورتِ حال کو تبدیل کیا۔ جناب محمد یعقوب علی صاحب کا مزید کہنا یہ ہے کہ پتھر مار کر انسان کی جان لینا اس دین کے لیے قابلِ تحسین نہیں ہو سکتا جیسے رحمت للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ یہ رجم کی

سزا نو رومیوں اور یہودیوں میں رائج تھی جس کا اسلام نے خاتمہ کر دیا ہے۔ سابق چیف جسٹس صاحب نے اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اپنے قول کے حق میں کتب تفسیر و حدیث کے حوالوں سے کچھ دلائل و شواہد پیش کرنے کی بھی سعی کی ہے جس کا مختصر تجزیہ یہاں مقصود ہے۔

آغاز بحث میں صاحب مضمون فرماتے ہیں کہ سورۂ نور آیت نمبر ۲ میں ارشاد باری ہے کہ مرد اور عورت اگر زنا کریں تو ان میں سے ہر ایک کو سو کوڑوں کی سزا دو۔ یہاں "الزانی" اور "الزانیة" کے شروع میں الف لام استعمال ہوا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ یہاں بیان کردہ سزا کا اطلاق ہر زانی اور زانیہ پر ہوگا۔ خواہ وہ شادی شدہ ہوں یا کنوارے۔ اس کے حق میں پہلا حوالہ جو انہوں نے دیا ہے وہ ابو حیان کی تفسیر البحر المحیط جلد ۶ صفحہ ۴۲۸ کا ہے۔ حوالوں پر گفتگو سے پہلے یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ ہماری معلومات کے مطابق یعقوب علی صاحب عربی زبان پر دسترس نہیں رکھتے، اس لیے ظاہر ہے کہ یہ حوالے ایسے منکرین حدیث کے فراہم کردہ ہیں جو سنت سے ثابت شدہ حد رجم کو تسلیم نہیں کرتے۔ اب ہم تفسیر البحر المحیط کا حوالہ لیتے ہیں۔ اس میں بلاشبہ آغاز کلام اس سے ہے کہ "ال" عموم کے لیے ہوتا ہے۔ لیکن اس کے بعد ابو حیان فرماتے ہیں۔

وقال ابن سلام وغیرہ ھو مختص بالبکرین"

ابن سلام اور دوسرے حضرات کہتے ہیں کہ یہ "ال" تخصیص کا ہے جو سزا کو غیر شادی شدہ زانیہ اور زانی کے لیے مختص کرتا ہے۔

آگے لکھتے ہیں:

واتفق فقہاء الامصار علی ان المحصن یرجم ولا یجلد

(بلاد اسلام کے فقہاء کا اتفاق ہے کہ شادی شدہ زانی کو رجم کیا جائے، کوڑے نہ لگائے جائیں۔)

پھر لکھتے ہیں:۔

وقد ثبت الرجم بالسنة المستفیضة وعمل بہ بعد الرسول خلفاء الاسلام ابوبکر وعمر وعلی ومن الصحابة جابر وابوھریرة وبریدة الاسلمی وزید بن خالد۔

(حدرجم سنت مشہورہ سے ثابت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد خلفائے راشدین حضرت ابوبکر، عمر، علی اور صحابہ کرام حضرت جابر، ابوہریرہ، بریدہ اسلمی، زید بن خالد، رضی اللہ عنہم نے اسی کے مطابق عمل فرمایا ہے)۔

یہ ساری عبارات اسی صفحہ ۴۲۸ پر درج ہیں۔ جن کا حوالہ جسٹس صاحب نے دیا ہے، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ حوالہ مہیا کرنے والے لوگ دوسرے اقوال کو تو ہضم کر گئے اور صرف ایک تمہیدی مجمل فقرہ جج صاحب تک پہنچنے دیا۔ پھر مزید دلچسپ بات یہ ہے کہ جج صاحب "المحیط" کا حوالہ دینے کے بعد فرماتے ہیں کہ تفسیر نہر الماد جو المحیط کے حاشیے پر چھپی ہے اس میں بھی اسی بات کی تائید ہے جو المحیط میں بیان ہے۔ شاید جج صاحب اور جن صاحب سے انہوں نے یہ حوالہ نقل کیا ہے، دونوں کے علم میں یہ حقیقت نہیں ہے کہ "النہر" جو المحیط کے حاشیے پر چھپی ہے۔ یہ کسی دوسرے مفسر کی تفسیر نہیں ہے۔ یہ البحر المحیط ہی کا اختصار ہے جو خود مصنّف ابوحیان ہی نے کیا ہے اور اس کی تصریح پہلی جلد میں اور اس کے بعد ہر جلد کے سرورق پر دی گئی ہے۔ چنانچہ یہ خلاصہ تفسیر جو بڑی تفسیر کے حاشیے پر مطبوعہ ہے۔ اس کے صفحہ ۴۲۸ ہی پر اس ابتدائی فقرے سے اخذ کردہ مفہوم کا "بھی موجود ہے جو فقرہ یعقوب علی صاحب نے نقل کیا ہے۔ حاشیے میں مصنّف کہتے ہیں:۔

"کہ اگر تم یہ کہو کہ الف لام کا تقاضا یہ ہے کہ کوڑے کی سزا کا حکم تمام زانی مردوں اور عورتوں سے متعلق ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ الف لام کی دلالت علی الاطلاق ہے جو کُل پر بھی منطبق ہو سکتی ہے اور بعض پر بھی، اور متکلم کا مقصود شادی شدہ یا غیر شادی شدہ دونوں میں سے کوئی ایک ہو سکتا ہے"۔

اس کے بعد فاضل جج امام رازی کی تفسیر کی جلد ۶، صفحہ ۱۴۴ کے حوالے سے لکھتے ہیں:۔

"امت کا اس پر اتفاق ہے کہ سورۂ نور میں سو کوڑوں کی جو سزا بیان ہوئی ہے۔ اُس کا اطلاق ہر قسم کے زنا پر ہوتا ہے"۔

اب ملاحظہ فرمائیے کہ صحیح اور حقیقی صورتِ حال کیا ہے؟ امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر جلد ۶ کے صفحہ نمبر ۱۳۰ سے سورۂ نور کا آغاز کرتے ہیں۔ امام رازی شافعی المسلک ہیں اور صفحہ ۱۳۲ پر وہ امام شافعی کا قول نقل کرتے ہیں:۔

حد الزنا ان کان محصناً یرجم وان لم یکن محصناً یجلد۔

(زنا کی حد یہ ہے کہ اگر زانی شادی شدہ ہو تو رجم کیا جائے، اور کنوارہ ہو تو اُسے دُرّے لگائے جائیں۔)

آگے صفحہ ۱۳۳ پر اس حدیثِ صحیح کا ذکر کرتے ہوئے جس میں وارد ہے کہ مسلمان کی جان لینا تین صورتوں میں جائز ہے جس میں ایک یہ ہے کہ وہ شادی ہو جانے کے بعد زنا کرے۔ پھر لکھتے ہیں:۔

واذا ثبت انہ وجد الزنا بعد احصان، وجب الرجم لھذ الحدیث

(اگر ثابت ہو جائے کہ اُس کے نکاح کے بعد زنا کیا ہے تو اس حدیث کی رُو سے اُسے سنگسار کرنا واجب ہے)۔

صفحہ ۱۳۴ پر پھر فرماتے ہیں:۔

حد الزنا علی الثیب الرجم وحد البکر الجلد والتغریب (شادی شدہ پر زنا کی حد رجم ہے اور کنوارے کے لیے کوڑے اور جلا وطنی)۔

صفحہ ۱۳۵ پر سورۂ نور کی آیت اور احادیثِ رجم پر بحث کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

الخبر المتواتر یقتضی وجوب الرجم -(احادیثِ متواترہ رجم کے وجوب کا تقاضا کرتی ہیں)۔

نیز لکھتے ہیں:۔

وتخصیص عموم القراٰن بالخبر المتواتر غیر ممتنع ....

(قرآنی آیات کے کسی عام حکم میں احادیثِ متواترہ کے ذریعے سے تخصیص ممنوع نہیں۔)

یعنی قرآن میں زنا کی عام حد سو کوڑے مذکور ہے لیکن اس عام حکم میں حدیثِ متواترہ کی رُو سے یہ تخصیص کر دی گئی ہے کہ:۔

"جو زانی شادی شدہ ہو اس کی سزا رجم ہے۔"

ان ساری تفصیلات و تصریحات کے بعد وہ عبارت آتی ہے جسے جسٹس یعقوب علی صاحب نے نقل کیا ہے۔ مگر اس کے نقل کرنے میں بھی ناقل نے کمال یہ کیا ہے کہ اُس کا فقط پہلا حصّہ لے لیا ہے اور آخری حصّہ حذف کر دیا ہے۔ پوری عبارت یوں ہے:۔

اتفق الامة علی ان قولہ سبحانہ وتعالیٰ الزانیہ والزانی یفید الحکم فی کل الزناة لکنهم اختلفوا فی کیفیة تلک الدلالة فقال قائلون لفظ الزانی یفید العموم والمختار انہ لیس کذلک ویدل علیه امور احدها ان الرجل اذا قال لبست الثوب او شربت الماء لا یفید العموم۔"

(امت کا اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد "الزانیہ والزانی" میں جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق سارے زانیوں سے ہو سکتا ہے۔ لیکن اس میں اختلاف ہے کہ اس حکم کی دلالت کی نوعیت کیا ہے۔ بعض لوگوں نے کہا ہے کہ یہ حکم عموم کا فائدہ دیتا ہے۔ اگر قابلِ ترجیح قول یہ ہے کہ اس میں عموم نہیں ہے اور اس کا ثبوت مختلف امور سے ہوتا ہے۔ مثلاً یہ کہ جب ایک شخص کہے کہ میں نے کپڑا پہنا یا پانی پیا تو الثوب اور الماء کے جو الفاظ آتے ہیں وہ "ال" کے باوجود عموم کا فائدہ نہیں دیتے، یعنی قائل کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ ہر میں نے ہر قسم کا کپڑا پہنا یا ہر قسم کا پانی پیا۔)

یہ قریب قریب وہی بات ہے کہ جو پہلے ہم محیط کے حوالے سے نقل کر چکے ہیں۔ اس کے بعد امام رازی نے آئندہ صفحات میں رجم کی شرائط کی مزید تفصیل دی ہے، مثلاً شادی شدہ ہونے کے علاوہ زانی عاقل و بالغ ہو، آزاد ہو، غلام نہ ہو۔ اگر عورت حاملہ ہو گئی تو وضع حمل کے بعد تک حدِ رجم مؤخر کر دی جائے گی، جیسا کہ قبیلہ جُہَینہ کی عورت کے معاملے میں آنحضورؐ نے کیا۔ عورت ہو تو اس کے لیے ایک گڑھا کھدوا جائے گا۔ صفحہ ۱۴۷ تک یہ ساری تفصیلات بیان کی گئی ہیں جو حدِ رجم ہی سے متعلق ہیں۔ اب یہ دیانت کی کون سی قسم ہے کہ ایک ناتمام فقرہ تو لے لیا جائے اور بقیہ سارے مباحث سے آنکھیں بند کر لی جائیں اور فقط یہ کہہ دیا جائے کہ امام رازی کے نزدیک بھی ہر زانی کی سزا فقط کوڑے ہیں۔

اس کے بعد یعقوب علی صاحب لکھتے ہیں:۔

"جو لوگ رجم کے قائل ہیں، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ بعض احادیث میں مذکور ہے کہ قرآن مجید میں ایک ایسی آیت تھی جس میں بوڑھے زانی و زانیہ کے لیے حدِ رجم کا ذکر تھا لیکن وہ آیت بعد میں

منسوخ ہو گئی، لیکن ان احادیث کی سند کمزور ہے۔"

یہ خواہ مخواہ کا خلطِ مبحث ہے۔ قرآن مجید جو اس وقت ہمارے پاس موجود و محفوظ ہے، اس کی ترتیبِ تلاوت آنحضورؐ نے وحی کے مطابق مقرر فرمائی ہے اور کاتبین وحی سے اُسے لکھوا بھی لیا تھا۔ اس کی دوبارہ کتابت پر جب حضرت ابوبکرؓ نے حضرت زیدؓ بن ثابت کو مامور فرمایا تھا تو ہر آیت کے لیے کم از کم دو قاری صحابہ کرام کی شہادت لی گئی تھی۔ چنانچہ موجودہ مصحف کی صحت و تواتر پر صحابہ کرامؓ سے لے کر اب تک سلف و خلف کا اجماع ہو چکا ہے۔ موجودہ متنِ قرآن کے سوا بعض شاذ قرائتیں یا آیتیں خواہ قوی الاسناد احادیث میں منقول ہوں یا ضعیف الاسناد روایات میں، ان پر نہ الفاظِ قرآنیہ کا اطلاق ہو سکتا ہے، نہ انہیں احکامِ شرعیہ کا ماخذ قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک حدِ رجم کا تعلق ہے اُس کا قطعی ثبوت سنتِ نبویہؐ، سنتِ خلفائے راشدینؓ اور اجماعِ امت سے فراہم ہوتا ہے اور شرعی احکام و حدود کا سرچشمہ اور ماخذ جس طرح کتاب اللہ ہے اسی طرح سنتِ رسول اللہ ہے۔ یہ امر قرآن مجید سے بھی ثابت ہے اور ہمارے دستور میں بھی اس کی صراحت موجود ہے۔

اس مقام پر جج صاحب نے بعض روایات ایسی نقل کی ہیں جن کے ماخذ کا حوالہ بھی نہیں دیا اور اُن کا مضمون بھی باہم متضاد ہے۔ مثلاً ایک روایت میں مروان حضرت زیدؓ بن ثابت اور حضرت عمرؓ کے آپس میں گفتگو کا ذکر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی مذکور ہے کہ اس گفتگو کے بعد حضرت عمرؓ نے جا کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے آیت رجم کے بارے میں دریافت فرمایا۔ جناب یعقوب علی صاحب کو معلوم ہونا چاہیے کہ مروان کی عمر وصالِ نبویؐ کے وقت بمشکل پانچ برس ہو گی۔ اس طرح کا عہدِ نبوی کا مکالمہ جس کا ذکر یہاں ہو رہا ہے، اس میں بھلا مروان کیسے شریک ہو سکتا ہے اور رجم کی بحث میں کیسے حصہ دار ہو سکتا ہے۔

جسٹس صاحب اس کے بعد لکھتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کی سزا دی تو ہے مگر یہ سورۃ نور کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے۔ جب سورۃ نورؔ میں سو کوڑوں کی سزا کا حکم نازل ہو گیا، اس کے بعد آنحضورؐ نے رجم کی سزا کبھی نہیں دی۔ جج صاحب کے بقول یہ موقف اختیار کر لینے کے بعد سورۃ نور کی آیت اور ان احادیث میں تطبیق ہو جاتی ہے، جن میں رجم کا ذکر ہے۔ یہ موقف بھی

سراسر تصنع و تکلف پر مبنی اور خلافِ حقیقت ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت زید بن خالد کی روایت جسے بخاریؒ، مسلمؒ، ابو داؤدؒ، ترمذیؒ، نسائیؒ، ابن ماجہؒ اور امام احمد نے نقل کیا ہے۔ اس میں بیان ہے کہ دو اعرابی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس مقدمہ لائے۔ ایک نے کہا کہ میرا بیٹا اس دوسرے شخص کے ہاں اجرت پر کام کرتا ہے، اس نے اس شخص کی بیوی سے زنا کیا۔ آپ ہمارے درمیان کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔ آنحضورؐ نے فرمایا: میں کتاب اللہ ہی کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ تیرے بیٹے کے لیے سو کوڑے ہیں اور ایک سال کے لیے اسے شہر بدر کیا جائے۔" پھر آپ نے قبیلہ اسلم کے ایک شخص سے فرمایا۔ "اے انیسؓ جاؤ اور اس شخص کی بیوی سے اس معاملے میں پوچھو۔ اگر وہ اعترافِ زنا کرے، تو اسے رجم کر دو"۔ چنانچہ اس نے جرم کا اعتراف کیا اور رجم کر دی گئی۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آنحضورؐ نے بیک وقت ایک ہی مقدمے میں غیر شادی شدہ زانی کو کوڑے لگوائے اور شادی شدہ زانیہ پر رجم کی حد جاری فرمائی۔ دوسرے لفظوں میں یہ نظریہ بالکل غیر صحیح ہے کہ رجم کی سزا منسوخ ہو گئی۔ رجم کی حد حضرت ماعز اور خاتون غامدیہ پر بھی نافذ ہوئی اور اس کے راویوں اور شاہدین میں حضرت ابو ہریرہؓ، حضرت خالدؓ بن ولید اور حضرت ابن عباسؓ شامل ہیں، جو سورۂ نور اور واقعہ افک کے بعد مدینہ میں آ کر مقیم ہوئے۔ بخاری، کتاب الحدود، رجم المحصن کی شرح کرتے ہوئے حافظ ابن حجر فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ جو رجم کے شاہد و راوی ہیں وہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے اور ابن عباس ۹ھ میں والدہ کے ساتھ ہجرت کر کے مدینہ پہنچے اور سورۂ نور کا نزول اور اس میں بیان کردہ واقعہ افک ۵ھ سے بہر حال پہلے پیش آیا۔ حضرت خالد بن ولیدؓ بھی طبقات ابن سعد کے مطابق صفر ۸ھ میں مسلمان ہوئے۔

حضرت جابرؓ بن عبد اللہ کی ایک حدیث ابو داؤد اور نسائی میں مروی ہے کہ ایک زانی کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف سزائے تازیانہ دی، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے تو آپ نے اسے رجم کرایا۔ اس کے بارے میں غالباً پہلے یہ ثابت و معلوم نہ ہو سکا ہو گا کہ وہ شادی شدہ ہے۔ اور بعد میں اس کا ثبوت فراہم ہوا ہو گا۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوا کہ شادی شدہ زانی کی سزا رجم ہے اور غیر شادی شدہ کی سزا جلد تازی ہے اور یہ دونوں سزائیں اپنی اپنی جگہ پر ایک ہی زمانے میں رائج و نافذ تھیں۔ اس میں نسخ و تصادم یا تقدیم و تاخیر کا مفروضہ قطعی غلط ہے۔ امام بدر الدین عینیؒ اور دوسرے محدثین و

مورخین نے بھی احادیثِ رجم کی تشریح میں واضح کر دیا ہے کہ سورۂ نور کا نزول اور واقعۂ افک کا صدور پہلے ہوا ہے اور رجم کی سزا بعد میں نافذ ہوتی رہی ہے اور یہ خیال باطل ہے کہ سورۂ نور کے بعد رجم کی سزا جاری نہیں ہوئی۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا، رجم کا حد ہونا سنتِ متواترہ سے بلاشک و شبہ ثابت ہے۔ اور سنت کی حجیت، اس کا ماخذِ دین ہونا اور واجب الاتباع ہونا کتاب اللہ ہی سے ثابت ہے۔ یہی منشا ہے آنحضورؐ کے اس ارشاد کا کہ میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا، جس کے بعد آپؐ نے رجم کی حد جاری فرمائی۔ اور آپ کے بعد پوری امت پر اطاعتِ رسولؐ اسی طرح واجب ہے جس طرح اللہ کی اطاعت واجب و لازم ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ (النساء۔ ۸۰)

اس بحث کے دوران میں جناب مضمون نگار نے شاہ ولی اللہ صاحب کے حوالہ سے یہ لکھا ہے کہ سورۂ نساء آیت نمبر ۱۶ میں زنا کی سزا بیان نہیں ہوئی۔ بلکہ یہاں عملِ قومِ لوط کی سزا کا ذکر ہے۔ یہ بھی خواہ مخواہ مسئلہ کو الجھانے کی کوشش ہے اور اس کا مقصود اگر یہ مغالطہ انگیزی ہے کہ شاہ صاحب رجم کے قائل نہیں تو یہ قطعاً غلط اور بے جا اتہام ہے۔ اس کی تردید کے لیے ایک ہی حوالہ کافی ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ جلد ۲ ص ۵۰۴ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

اعلم انہ کان من شریعۃ من قبلنا القصاص فی القتل و الرجم فی الزنا والقطع فی السرقۃ، فھذہ الثلاث کانت متوارثۃ فی الشرائع السماویۃ واطبع علیھا جماھیر الانبیاء والامم

(جان لو کہ ہم سے پہلی شریعتوں میں بھی قتل میں قصاص، زنا پر رجم اور چوری میں قطعِ ید موجود تھا۔ یہ تینوں حدود آسمانی شریعتوں میں متوارث چلی آ رہی ہیں اور تمام انبیاء اور امتوں کی فطرت اور سرشت میں یہ قوانین شامل رہے ہیں)۔

جن لوگوں نے یہ غلط نظریہ قائم کر رکھا ہے کہ عہدِ نبویؐ میں رجم کی سزائیں سورۂ نور کے نزول سے پہلے دی گئی ہیں۔ ان کے پاس اس حقیقتِ ثابتہ کی کیا توجیہ ہے کہ حدِ رجم کا اجراء حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ نے بھی کیا ہے۔ حضرت عثمانؓ کو جب مفسدین نے گھر میں محصور کر دیا تھا اور ان کے خلاف ہر طرح کے بے ہودہ الزامات عاید کر رہے تھے (اور آپ کو شہید کرنے کی باتیں کر رہے

تھے) تو انہوں نے دیوار پر سے جھانک کر فرمایا تھا کہ:

"نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمان کا قتل صرف تین صورتوں میں روا رکھا ہے۔ ایک یہ کہ وہ کسی کو ناحق قتل کرے، دوسرے یہ کہ وہ مرتد ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ وہ شادی شدہ ہونے کے بعد زنا کا ارتکاب کرے۔ میں نے ان میں سے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا تو تم میرا خون کس بنا پر بہانا چاہتے ہو"۔

اگر زانی محصن کی سزائے موت میں ذرہ برابر بھی شبہہ یا اختلاف ہوتا یا سورۂ نور کی آیت نے اسے منسوخ کر دیا ہوتا تو فتنہ پردازوں کے لیے یہ کہنا نہایت آسان تھا کہ حضرت عثمانؓ آنحضورؐ کی جانب غلط بات منسوب کر رہے ہیں۔ لیکن اُن کا خاموش رہنا یہ ثابت کرتا ہے کہ رجم کی سزا کا آنحضورؐ کی قولی و فعلی سنّت ہونا ایک مسلّمہ ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔

یعقوب علی صاحب نے بحث کے آخر میں لکھا ہے کہ نظامی، ابن رشید، خوارج، معتزلہ اور امام طحاوی نے بھی رجم کے خلاف وزنی دلائل دیے ہیں۔ ان میں سے بعض نام اور الفاظ تو معلوم ہوتا ہے کہ نقل کرتے وقت اس طرح بگاڑ دیے گئے ہیں کہ اُن کا پہچاننا بھی مشکل ہے۔ جہاں تک خوارج و معتزلہ کا تعلق ہے، اُمت نے اُن کے گمراہانہ نظریات اور انکارِ سنّت سے ہمیشہ اظہارِ براءت کیا، چنانچہ اُن کا نام و نشان مٹ گیا۔ خوارج کے تضاد کا عالم یہ تھا کہ ایک طرف وہ بعض صحابہ کرامؓ تک کو گناہ کبیرہ کا مرتکب قرار دے کر کافر اور واجب القتل قرار دیتے تھے۔ اور دوسری طرف رجم کے منکر تھے، حالانکہ زنا گناہِ کبیرہ ہے، تو اس پر سزائے قتل اُن کے ہاں جائز (بلکہ لازم) ہونی چاہیے۔ امام طحاوی کا جو مسلک اُن کی کتاب شرح معانی الآثار کے حوالے سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ بھی اُن پر جھوٹی تہمت ہے۔ اس کتاب کے ایک باب کا عنوان "باب حد الزانی المحصن" ہے۔ اس میں بحث صرف اس امر پر کی گئی ہے کہ شادی شدہ زانی کی حد صرف رجم ہے یا اس کے ساتھ کوڑے بھی ہیں۔ پوری بحث کے آخر میں وہ لکھتے ہیں:

"الزانی المحصن علیہ شیٔ واحد، فیکون علیہ الرجم الذی قد اتفق انہ علیہ وینتفی عنہ الجلد الذی لم یتفق انہ علیہ وھذا قول ابی حنیفہ و ابی یوسف و محمد رحمۃ اللہ علیہم"۔

(زانی محصن کی صرف ایک ہی سزا ہے اور وہ رجم ہے جس پر سب کا اتفاق ہے۔
اس سے زائد اسے کوڑوں کی سزا نہیں دی جائے گی۔ کیونکہ شادی شدہ زانی کو رجم کے ساتھ کوڑوں کی سزا کے اضافے پر اتفاق نہیں۔ امام ابوحنیفہ رح، قاضی ابو یوسف اور امام محمد رحمۃ اللہ علیہم کا یہی قول ہے)۔

اس مختصر تبصرے سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یعقوب علی صاحب دانستہ یا نادانستہ حقائق کو مسخ کرنے اور عبارتوں میں قطع و برید کرنے کے باوجود کہاں تک اپنے موضوعات و دعاوی کو صحیح ثابت کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ سردست ہم نے اپنے تجزیے کو صرف اس حد تک محدود رکھا ہے کہ جس حد تک جج صاحب کے مضمون پر تنقید کے لیے ضروری تھا۔ اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہمارے پاس رجم کے حق میں مزید دلائل یا مخالفینِ رجم کے دیگر اعتراضات کا جواب نہیں ہے۔

(بقیہ مطبوعات) لہٰذا پوری مثلث صاف۔ اب قرآن بھی آزاد ہے اور قرآن کا حلیہ بگاڑنے والے بھی۔
مفکرین اسلام اور علمائے دین کو محسوس کرنا چاہیے کہ اس وقت جب کہ اسلامی نظام اور قانون شریعت کا آوازہ بلند ہو رہا ہے۔ منکرین حدیث کو اپنا دوسرا حملہ کرنے کی جرأت اس وجہ سے ہوئی ہے کہ آپ کی فکر میں انتشار رہے اور آپ طرح طرح کی کمزور اور متفرق باتیں کر رہے ہیں۔ بہ طور خود احساس نہیں ہوا تو ایک فتنہ آپ کو احساس دلانے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا ہے جس نے رجم، سود اور زکوٰۃ ہی کے متعلق نہیں حدیث و سیرت اور پورے تصور دین ہی کو چیلنج کر دیا ہے۔
رسولِ خدا کی تبیینِ قرآن اور عملی اسوہ سے بے نیاز ہو کر تلعب بالقرآن کرنے والی عقل فرمایہ کہاں کہاں پٹکتی ہے۔ یہ کتاب اس کا ایک عبرت ناک مرقع ہے۔ "قرآن بلا رسولؐ" کے اس ہنڈ ولے میں جو بیٹھا اُسے نہ پھر رسول ملے گا، نہ قرآن، بلکہ اُس کا تعقل بھی اضحوکہ بن جائے گا۔

پاکستان میں نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل کی حکمتِ عملی

ڈاکٹر سعید اللہ قاضی

(۲)

معلم تعلیمی پالیسی کی باگیں ایسے لوگوں کے ہاتھ میں ہوں جو اسلامی ذہن رکھتے ہوں۔ اسلامی نظامِ تعلیم کو جانتے ہوں اور اسے قائم کرنا چاہتے ہوں۔ اس قسم کے معلموں کے بغیر مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔

نظامِ تعلیم میں تربیت اساتذہ کا مسئلہ نہایت اہم ہے۔ نصاب تعلیم جس نوعیت کا بھی ہو، اگر پڑھانے والا مسلمان ہو اور خوبیوں کا مالک ہو تو وہ اس کو صحیح سمت میں ڈال سکتا ہے۔ اُستاد کی ذات اور اس کا کردار کسی بھی نظامِ تعلیم میں بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ اگر نظامِ تعلیم بگڑے ہوئے اخلاق اور عقیدے کے لوگوں کے ہاتھوں میں ہو تو اُن کے ہاتھوں جو نسل پروان چڑھے گی، اس سے کوئی اچھی توقعات وابستہ کرنا تاریک رات میں کسی تاریک کمرے کے اندر ایک کالی بلی کی تلاش کے مترادف ہے۔[۱]

اسلامی نظامِ تعلیم قائم کرنے کے لیے معلمین کو پڑھائی کا اسلوب بدلنا ہوگا۔ اُستاد صرف اس لیے نہیں کہ طلباء کو مصروف کار رکھے یا صرف وقت گزار کے تنخواہ وصول کرے، بلکہ وہ اپنے شاگردوں کو رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کی روشنی میں پڑھائے۔ اس لیے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ "اِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً" میں معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ استاد کا وظیفہ گویا کہ نبوت

[۱] محمد حسین: سید مودودیؒ کے تعلیمی نظریات۔ مودودی تعلیمات ص ۱۶۳

کی ذمہ داریوں میں جزوی طور پر حصہ لیتا ہے۔[1]

اسلامی تربیت کا پہلا وسیلہ معلم کا کردار ہے اور نصیحت کا عمل کردار کے بعد شروع ہوتا ہے، یعنی بچوں کو جن امور کی تربیت دینی مقصود ہو، معلم اُن کا عملی نمونہ پیش کرے۔ پرائمری سے یونیورسٹی کی سطح تک تمام تعلیمی اداروں میں اسلامی روح جاری و ساری کرنے کے لیے اساتذہ کرام کے لیے ضروری ہوگا کہ وہ اسلام کو اپنی زندگیوں میں نافذ کریں۔ طلباء کے دل از خود ان کی طرف مائل ہو جائیں گے۔

ہر مسلمان معلم ایک داعی کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کی ذمہ داری ہے کہ وہ اسلام کی دعوت طالب علموں کے سامنے کلاس کے اندر پیش کرے، اور جب طلباء استاد کو اسلامی اخلاق کا ایک چلتا پھرتا نمونہ دیکھیں گے تو وہ خود اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جائیں گے۔[2]

اگر استاد شاگرد کو پابندیٔ وقت کا سبق دے اور خود اس کا عملی مظاہرہ کرے تو طلبہ پر ضرور اس کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن جب وہ خود دیر سے آنے کا عادی ہو اور طلبہ کو وقت پر آنے کا درس دیتا ہے تو ایسا استاد شاگردوں کو متاثر کرنا تو درکنار خود کو ان کی نظروں میں گراتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ طلباء بھی بے قاعدگی میں اپنے استاد کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے نظر آتے ہیں۔[3]

مدرسوں اور کالجوں کے لیے معلمین و معلمات کے انتخاب میں ان کی سیرت و کردار اور دینی حالت کو ان کی تعلیمی قابلیت سے زیادہ اہمیت دینی چاہیے۔ اُن کے انتخاب کے لیے (آئی۔ ایس۔ ایس۔ بی) کے طرز پر دیندار ماہرینِ تعلیم کا ایک بورڈ ہونا چاہیے جو امیدوار کو ہفتہ عشرہ اپنے پاس رکھے۔ اس کی نشست و برخاست، کھانے پینے کے انداز، دینداری اور تدریسی قابلیت پر کڑی نظر

---

[1] پروفیسر خورشید احمد۔ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید، مطبوعہ ——— تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور ۱۹۷۸ء ص ۴۷

[2] محمد قطب، موجودہ نظامِ تعلیم سے اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف۔ مجموعہ تقاریر نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید کل پاکستان تعلیمی کانفرنس ۱۹۷۸ء۔ لاہور

[3] اسلامی نظامِ تعلیم۔ ص ۳۶

رکھے۔ ساتھ یہ بھی دیکھے کہ تعلیم کے ساتھ ان کا دلی لگاؤ ہے یا نہیں، اور پھر وہ اس کو ایک مقدس پیشہ بھی سمجھتے ہیں یا نہیں۔

اس سلسلے میں ایک عملی مثال پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۱۳ء میں صاحبزادہ عبدالقیوم خان نے اسلامیہ کالج قائم کیا تو اس کے لیے اساتذہ کا طریقہ انتخاب یہی تھا۔ وہ امیدواروں کو پہلے اپنے پاس یا اپنے ساتھیوں کے ساتھ رکھتے، وہ ان پر کڑی نظر رکھتے، کلاس میں ان کی تدریسی قابلیت کو جانچتے اور دس پندرہ دن کے بعد وہ استاد کا انتخاب عمل میں لاتے۔ یہی طریقہ آج کل بھی اپنانے کی اشد ضرورت ہے۔

ایک حقیقی استاد ایک مشنری ہوتا ہے۔ وہ محض روزی کمانے کے لیے دوسروں کے کاموں کی طرح استادی کا کام نہیں کرتا۔ حقیقی استاد کی زندگی کا یہ مشن ہوتا ہے کہ جو تہذیب، عقائد، افکار، عبادات اور خصائل اس کو اپنے اسلاف سے ملے ہیں وہ ان کو آگے آنے والی نسل تک صحیح شکل میں پوری دیانت داری کے ساتھ منتقل کرے تاکہ نئی نسل اس راستے پر آگے بڑھے جس پر اس امت کا آگے بڑھنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ معلمی ایک مشن ہے اور اگر کوئی معلم اس کو دینی جذبے کے ساتھ نہیں کرتا تو وہ "ملازم ہے، معلم نہیں ہے"۔[1]

ہماری درس گاہوں میں اسلامی تعلیم کے لیے غیر مسلم اساتذہ کو ذریعہ بنانا ناقابل تصور ہے۔ ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ اسلامی طرز پر طلبہ کی پرورش کریں گے، "کریلے کی بیل سے خوشۂ انگور کی امید رکھنا ہے"۔ بعض دوسرے دائروں میں ان سے خدمات لی جا سکتی ہیں، مگر تعلیم جیسے بنیادی نظام میں نہیں۔

محض دینیات کے لیے چند مولوی مدرسینِ دینیات کا تقرر بالکل بے فائدہ ثابت ہوگا جب کہ دوسرے مضامین کے پڑھانے والے غیر مسلم ہوں۔ وہ ضرور زندگی اور اس کے مسائل اور معاملات کے متعلق طلبہ کے نظریات اور تصورات کو اسلام کے مرکز سے پھیر دیں گے۔ اس زہر کا تریاق محض دینیات کی تدریس سے فراہم نہ ہو سکے گا۔ بنگال میں ہندو اور افغانستان میں کمیونسٹ

[1] مودودی، معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز۔ مشمولہ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید، ص ۱۰۸، ۱۰۹۔

اساتذہ کے کردار سے جو نتیجے سامنے آتے ہیں وہ کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ اس قسم کی حالت آج کل سندھ میں بھی ہے۔ جہاں درس گاہوں میں ہندو اساتذہ کام کرتے ہیں اور سندھ میں جو غیر اسلامی تحریک چل رہی ہے وہ غالباً اُن اساتذہ ہی کی مرہونِ منت ہے یا کم سے کم ان کا اس میں خاصا موثر حصہ ضرور ہے۔

مخصوص حالات میں کسی غیر مسلم ماہر فن کی خدمات لی جا سکتی ہیں بشرطیکہ مجموعی ماحول اور اسٹاف کا کردار مضبوط اور صحت مند ہو۔ لیکن عام حالات میں یہ صورت مناسب نہیں۔ خاص طور پر موجودہ مرحلے میں ہماری درس گاہوں کے اساتذہ ایسے لوگ ہوں جن کی زندگی اسلامی ثقافت کے رنگ کی مظہر ہو۔ ایسے اساتذہ تلاش کیے جائیں جو علوم جدیدہ میں مہارت رکھنے کے ساتھ ساتھ قرآن وحدیث میں بھی بصیرت رکھتے ہوں۔[1]

اساتذہ کی کثیر تعداد کا مطالعہ نہایت محدود ہوتا ہے اُن کی توجہ طلباء کی ذہنی نشوونما اور اُن کی کردار سازی کی طرف جاتی ہی نہیں۔

اساتذہ کی کثیر تعداد زندگی کے دوسرے میدانوں میں ناکام ہو کر با دلِ ناخواستہ معلمی کا پیشہ اختیار کرتی ہے۔ ان کو اس پیشے کی عظمت کا کوئی احساس نہیں ہوتا وہ صرف اس کو روزی کمانے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔

تعلیمی اداروں میں ایسے اساتذہ کا تقرر کیا جائے جن کا مطالعہ وسیع ہو اور تجربے اور اعلیٰ کردار کے مالک ہوں۔[2]

اس سلسلے میں تجویز یہ ہے کہ یونیورسٹی سطح پر پڑھانے والا استاد ضرور پی۔ ایچ۔ ڈی ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ پرائمری سے لے کر کالج کی سطح تک اساتذہ کی تنخواہ اُن کی تعلیمی قابلیت (یعنی ڈگری) نہ کہ عہدے کے مطابق مقرر ہو۔ ایک ایم۔ اے کی ڈگری رکھنے والا استاد اگر پرائمری سکول میں بھی پڑھائے تو اُس کو اس دوسرے ایم۔ اے کی ڈگری رکھنے والے استاد کے برابر تنخواہ ملنی چاہیے جو

---

[1] تنقیحات ص ۲۹۲

[2] مسز شہناز، اسلام میں علم کی اہمیت اور ہماری تعلیمی حالت۔ پہلیک، ملتان عدد نمبر ۱۶۸

کالج یا ہائی اسکول میں پڑھاتا ہو۔ یہ طریقہ مصر میں رائج ہے۔ مخلوط طریقِ تعلیم کو ختم کرنا ہوگا، اور طلباء اور طالبات کے لیے الگ الگ درس گاہیں بنانی ہوں گی۔

ذرائع ابلاغ | احیائے اسلام اور اصلاحِ معاشرہ ممکن ہی نہیں ہے جب تک ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ کے پروگراموں میں انقلابی تبدیلی نہ ہو اور شیطانی تعلیم اور تربیت کے ان کے مراکز سے بے راہ روی اور عریانی کی اشاعت بند نہ ہو۔ اسلامی نظام میں ریڈیو، ٹی۔وی اور فلموں کے پروگرام مغربی ممالک سے بالکل مختلف ہونے چاہئیں۔ ان اداروں کو چاہیے کہ نظریۂ اسلام اور تعلیماتِ اسلام کے مبلّغ بنیں۔ اگرچہ ہر ایک کا طریقِ کار مختلف ہوگا لیکن انتہائی مؤثر ہوگا۔[۱]

"پچھلے دنوں ریڈیو، ٹیلی وژن اور اخبارات میں علاقائی ثقافت کا راگ اس طرح الاپا گیا کہ ہماری مسلم ثقافت، جس کے تحفظ و بقا اور تعمیر و ترویج کے لیے یہ ملک ہزاروں قربانیوں کے بعد قائم کیا گیا، شور و غوغا میں دب کر رہ گئی، حتیٰ کہ بعض نکتہ وروں نے کسی مسلم یا پاکستانی ثقافت کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اُن کے خیال میں پاکستان مختلف ثقافتوں کا گہوارہ ہے، جس کی اب تک کوئی اکائی قائم نہ ہو سکی"۔ البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر ان میں کچھ وجہ اشتراک پیدا ہو جائے اور وہ ایک دوسرے کے قریب آجائیں۔ بعض اربابِ سیاست ذرا اس سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔ اُنھوں نے کہا کہ پاکستان کئی قوموں کا مسکن ہے، جن کے مسائل اور مفادات جدا جدا ہیں، اس لیے ان میں سے ہر ایک کا حق ہے کہ وہ اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے آزاد ہو"۔[۲]

ایک عجیب بات ہے کہ ثقافت کے ان علمبرداروں کو ہندوستان اور روس جیسے مختلف النسل مختلف المذہب ملکوں میں تو ثقافتی یک جہتی نظر آتی ہے مگر پاکستان میں مشترکہ ثقافت کے عوامل مصنوعی دکھائی دیتے ہیں۔ رُوس یا دوسرے اشتراکی ملکوں میں جو ثقافتی اکائی پیدا ہوئی ہے یا ہو رہی ہے، اس کی پشت پر حکومت کی فوجی طاقت اور ابلاغِ عامہ کے ذریعے لوگوں کی ذہنی تطہیر (BRAIN WASHING) کا مسلسل عمل ہے۔

---

[۱] محمد انور قریشی - اصلاح معاشرہ کیسے ہو؟ لاہور

[۲] ڈاکٹر عبدالعزیز - ہماری اعلیٰ تعلیم اور ہم - مطبوعہ عزم نو ص ۳۶۲، ۳۶۳، ۳۶۴۔

جب ایک خاص قسم کا نشری پروگرام مدت تک جاری رہتا ہے تو سامعین اور ناظرین پر اس کا اثر ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ذہن بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے جو ان پروگراموں کے پروپیگنڈے کی حقیقت سے واقف ہوتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ مزاج میں ایسی تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہی باتیں جنہیں عقلاً یا اُن کے سیاسی سیاق میں صحیح نہیں سمجھا جاتا، حق معلوم ہونے لگتی ہیں اور علاقائی علمبرداروں کو اپنے مطلوبہ مقاصد میں کامیابی حاصل ہو جاتی ہے۔

پاکستان ایک نظریاتی ملک ہے جو اسلام کے نام پر قائم ہوا ہے۔ اس اصول کے مطابق اگر ان ذرائع سے اسلامی اقدار کے احیاء اور ان کی توضیح و تشریح کا کام لیا جاتا تو اس پر اشتراکیت کے نقیبوں کے لیے بھی اصولاً اعتراض کی گنجائش نہ تھی اس لیے کہ ملک کی نظریاتی اساس کو مستحکم کرنا اس کا بنیادی حق تھا۔[1] لیکن یہاں یہ حال ہے کہ "اسلام کے بارے میں اکثر پروگرام محض خانہ پُری کے لیے رکھے جاتے ہیں۔ مثلاً کراچی ٹیلی ویژن سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ پر ایک دس منٹ کا پروگرام ربیع الاوّل میں نشر ہوا جو اس قدر مشہور و مقبول ہوا کہ اس کے جاری رکھنے کا مطالبہ زور پکڑ گیا۔

ایک نظریاتی مملکت کے نمائندہ ادارہ ہونے کی حیثیت سے پاکستان ٹیلی ویژن کو مسلمانوں کے جذبات کا احترام کرنا چاہیے تھا۔ لیکن یہ مسئلہ عدالت میں گیا اور ٹی۔وی والوں کو عدالتی فیصلے کے مطابق اس پروگرام کو بند کرنے کا موقع مل گیا۔ ٹی۔وی پر یہ دس منٹ کا وقت بھاری گذرا لیکن لوک رنگ، لوک رقص، گیت، اخلاق سوز انگریزی فلموں اور رقص و موسیقی کے دوسرے پروگراموں کے لیے وقت کی کمی کا کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔

ثقافت پر عالمانہ بحث کا سلسلہ شروع ہوا اور ساتھ ساتھ عالم لوہار کا چمٹا اور سلیمان شاہ کے گھنگرو بھی بجتے رہے۔ یہ سلسلہ مہینوں جاری رہا اور ثقافت پروان چڑھتی رہی۔ ان مباحث کا اثر نوجوانوں پر زیادہ پڑتا ہے۔ یقیناً ثقافت کی ان اُلجھی ہوئی باتوں نے اُن کے ذہنوں کو اور اُلجھا دیا ہوگا۔ اور اُن کی بے یقینی پہلے سے زیادہ بڑھ گئی ہوگی۔[2]

---

[1] ڈاکٹر سعید العزیز۔ ہماری اعلیٰ تعلیم اور رہبر، مطبوعہ سرزم تو، ص ۲۶۲، ۲۶۳، ۲۶۴۔ [2] ایضاً

ایک دوسری روایت کے مطابق "ٹی۔وی اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ وہ وقت جو مطالعہ میں صرف ہونا چاہیے وہ اس کی نذر ہو جاتا ہے۔ والدین ٹی۔وی اور دیگر ذرائع تفریح پر روپے پیسے کی بھینٹ چڑھاتے ہیں۔ اور اولاد والدین کے شانہ بشانہ بیٹھ کر ریڈیو سے فلمی گانے سنتے ہیں، ٹی۔وی دیکھتے ہیں، سینما دیکھتے ہیں۔ فیشن پرستی اور بداخلاقی کے جراثیم کے جراثیم ان میں پوری طرح سرایت کر جاتے ہیں۔ پیسہ لٹایا جاتا ہے، وقت برباد کیا جاتا ہے۔ شرم و حیا اور اعلیٰ اخلاق کی اقدار ریزہ ریزہ کی جاتی ہیں[1]"

یونیورسٹیوں میں جو کچھ ہو رہا ہے یا ٹی۔وی، فلموں وغیرہ پر جو اسلوب اختیار کیا گیا۔ ان دونوں کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ دونوں صورتوں میں ان کا ہدف نوجوان ہیں۔ اس لیے دونوں کو ایک دوسرے کا تکملہ سمجھنا چاہیے جو ساری قوم کو ایک غلط راستے پر لے جانے میں ایک دوسرے کو سہارا دے رہے ہیں۔ ٹی۔وی نے آج کل نئے سیاسی حالات کے پیشِ نظر وقتی طور پر اسلام کی عبا پہن لی ہے جو خدا کرے روزمرہ کا معمول بن جائے[2] ریڈیو، اخبار، رسالے، ٹیلی ویژن اور فلم وغیرہ .... ذرائع کے محاسبہ کے لیے ایک اعلیٰ کمیٹی تشکیل دی جائے جس میں اسلامی نظریاتی کونسل، اوقاف اور دینی اداروں کے علما بھی شامل ہوں۔

مغربی تہذیب کی عشق بازی، جوا، مار دھاڑ، عشق کے دیوانوں کے گانے، جذبات کو اُبھارنے والی حرکات، فلموں، ڈراموں اور اشتہاروں کو دکھانا بند کیا جائے۔ گانا سنانے سے قبل اس کو روح کی تسکین اور تقویت کا ذریعہ قرار دینا اور ایسے الفاظ میں تعارف کرانا صریحاً بے دینی کی اشاعت اور غلط بیانی ہے۔

اسلام میں شادی سے قبل ملنا جلنا اور عشق بازی کی اجازت نہیں ہے۔ اور نہ ہی یہ ہمارا ملکی رواج ہے۔ پھر محبت کے جھوٹے اور خیالی افسانے اور ڈرامے دکھا کر پاکستان کے مسلمانوں کی عملی زندگی کا غلط اور جھوٹا نقشہ کیوں پیش کیا جاتا ہے اور قوم کو غلط راہ پر کیوں گامزن کیا جاتا ہے۔ لڑکی کو مطلوبہ

---

[1] اسلام میں علم کی اہمیت اور ہماری تعلیمی حالت۔ (مذکورۃ الصدر)

[2] ڈاکٹر عبدالعزیز۔ ہماری تعلیمی حالت اور ہم۔ مطبوعہ عزم نو ص ۳۶۶

کی ٹھاٹھ باٹھ، نمائش اور فضول خرچی دکھا کر عوام کے دلوں میں بے چینی کیوں پیدا کی جاتی ہے جب کہ ملکی زندگی میں ایسی مثالیں بہت کم ملتی ہیں۔ عام گھروں کی سادہ اور خوش حال زندگی کیوں نہیں کی جاتی جس میں عبادت، دیانت اور سخاوت کی مثالیں ہوں[۱]۔

اخبارات اور جرائد پر کڑی نظر رکھنی ہوگی۔ اس قسم کے جرائد بند کرنے ہوں گے جن میں مخالفِ اسلام مواد موجود ہو یا جن کے سرورق پر عریاں تصویریں ہوں۔

اسی طرح ایسی اشیاء کی درآمد پر بھی پابندی ہونی چاہیے جن پر اخلاق سوز تصویریں ہوں، مثلاً آجکل میک اپ کے سامان پر جس قسم کی ننگی تصویریں نظر آتی ہیں۔ ان کا سدِّ باب کرنا ہوگا۔

اپنے کارخانوں میں تیار کیے جانے والے مال پر بھی کڑی نظر رکھنی ہوگی۔ مختلف ڈبوں، صابن اور دوسری اشیاء کے کاغذ پر عورت کی طرح طرح کی تصاویر، غرض جہاں جہاں اور جس جس طریقے سے بھی مخالفینِ اسلام ہماری نسل کے اخلاق بگاڑنے کی کوشش کر رہے ہوں اس کا تدارک کرنا ضروری ہوگا۔

یہ وہ مختلف تدابیر ہیں جن کو اختیار کرنے سے موجودہ نظامِ تعلیم کو اسلامی نظامِ تعلیم کے قالب میں ڈھالنے کا کام شروع ہوسکتا ہے اور کچھ مدت میں مطلوبہ نتائج سامنے آسکتے ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ اربابِ کار اور خاص طور پر اساتذہ خدا پر بھروسہ کرکے خلوصِ دل اور ایک عزمِ جواں کے ساتھ اس کا آغاز کریں۔ واللہ اعلم بالصواب وما علینا الا البلاغ وما توفیقی الا باللہ علیہ توکلت والیہ انیب۔ تاریخ: ۱۹-۱۰-۸۰

ضمیمہ نمبر ۱: جناب سید سلیمان ندوی نے اپنے مضمون "مسلمانوں کی آئندہ تعلیم" مطبوعہ سوزِ نو میں اس بات پر زور دیا ہے کہ مسلمانوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی پر کافی توجہ دینی چاہیے۔ ان کو دوسرے ممالک پر انحصار کرنے کے بجائے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونا چاہیے۔ دوا کی گولی سے لے کر بین البراعظمی میزائیلوں تک اپنے ملک میں تیار کرنا چاہیے۔ غیر مسلم اقوام کے مقابلے میں ان کی کمزوری گناہ کے مترادف ہوگی بقول مولانا شمس الحق افغانی اگر دشمن کے پاس ایک سو جنگی جہاز ہوں اور ہمارے ۹۹، تو قیامت کے دن خدا ہم سے پوچھے گا کہ ہمارے پاس ایک جہاز کیوں کم تھا۔ اس لحاظ سے آج کل کے زمانے میں اٹیم بم

[۱] اصلاح معاشرہ کیسے ہو؟ ص ۲۳

سے لے کر ہائیڈروجن بم تک مسلمانوں کے پاس ہونے چاہئیں۔ اگر دنیا کے کسی میں بھی مسلمان اگر اپنے دشمنوں سے پیچھے رہے تو آیت واعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل" کی روشنی میں گنہگار ہوں گے اس لیے نظام کی اسلامی تشکیل میں اس بات کو سر فہرست رکھنا ہوگا۔

ضمیمہ نمبر 2: نظامِ تعلیم کے سلسلے میں قدیم و جدید کا امتزاج پیدا کرنے کے لیے گذشتہ تقریباً ۴۰ سال سے اسلامیہ کالج پشاور کی زیر سرپرستی ایک سنٹرل طبیہ کالج کام کر رہا ہے۔ گریجویشن کرنے کے بعد طلباء کو (B.TK) یعنی بیچلر آف طبیہ کی ڈگری ملتی ہے۔ راقم الحروف اس سنٹرل طبیہ کالج کا فارغ التحصیل ہے۔ میرے خیال میں یہ اپنی نوعیت کا پہلا ادارہ ہے لیکن اس کی طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دی جا رہی ہے۔

کتابیات

ابوالحسن علی ندوی، علوم اسلامیہ کے سرچشمے۔

ابوعمار زاہد الراشدی اسلامی نظامِ تعلیم کے بنیادی خدوخال۔

ابوسلمان شاہ جہان پوری قومی تعلیم کے چند مسائل۔ ایک تجزیہ۔

ابوالکلام آزاد مسلمانانِ ہند اور گورنمنٹ کی تعلیمی حکمتِ عملی۔

ابوالکلام آزاد عربی نصابِ تعلیم میں انقلابی تبدیلیوں کی ضرورت۔

احمد یار حافظ دینی حس کی پرداخت۔ نظامِ تعلیم میں اس کی ضرورت و اہمیت۔

احمد حسین کمال ڈاکٹر اسلام کا نظریۂ علم و نصاب اور برصغیر

آغا خان ڈاکٹر پاکستان میں تدریسِ فارسی و عربی کے لیے چند تجاویز۔

الطاف حسین حالی حالی کا نظریۂ تعلیم۔

الطاف حسین حالی اسلامی مدارس کا نصابِ تعلیم۔

الطاف حسین حالی عصری تعلیم۔

امجد علی شاکر حضرت لاہوری کے تعلیمی نظریات۔

خالد محمود ڈاکٹر	ہمارا نظامِ تعلیم اور اس کی درماندگی
خورشید احمد پروفیسر	نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید۔ مطبوعہ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیل جدید تنظیم اساتذہ پاکستان لاہور ۱۹۶۹ء
سید سلیمان ندوی	مسلمانوں کی آئندہ تعلیم
سعید اللہ قاضی ڈاکٹر و جہاں آرا ایم اے	اسلامی ذہن کیسے پیدا ہو۔ مقالہ جو تنظیمِ اساتذہ کی تعلیمی کانفرنس کوئٹہ منعقدہ جون ۱۹۸۰ء میں پڑھا گیا۔
سعید اللہ قاضی ڈاکٹر و جہاں آرا ایم۔اے	ایک مثالی استاد اور شاگرد کا کردار مطبوعہ لوح و قلم۔ ادارہ تعلیم و تحقیق پشاور یونیورسٹی ۱۹۸۰ء
سید متین ہاشمی	رائج الوقت درس نظامی کا جائزہ اور چند تجاویز
شفیق جالندھری	نظامِ تعلیم میں اسلامی رُوح کیسے پھونکی جائے۔
شہناز انصاری مسز	اسلام میں علم کی اہمیت اور ہماری تعلیمی حالت چہلیک ملتان عدد نمبر ۱۹۸
صوفی عبدالحمید سواتی	علم کز راہ حق نہ نماید جہل است
عبدالحمید ہاشمی	مضامین کی نظریاتی تعلیم
عبدالرزاق ڈاکٹر	اسلامی نظامِ تعلیم
عبدالصمد صارم	.... اور تیس سال گزر گئے۔
عبدالعزیز ڈاکٹر	ہماری اعلیٰ تعلیم اور ہم
عبدالعزیز ڈاکٹر	ثانوی تعلیم کا امروز و فردا
عبیداللہ خاں ڈاکٹر	اسلامی نظامِ تعلیم اور انگریزی
محمد ادریس کاندھلوی مولانا	مسئلہ تعلیم
محمد اسحاق مولانا	دینی درسگاہوں کو دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی عملی تدابیر
محمد اسماعیل بھٹی	معیارِ تعلیم کی پستی
محمد اشرف خان	موجودہ تعلیمی مسائل اور ان کا حل
محمد انور قریشی	اصلاحِ معاشرہ کیسے ہو، انجمن خدام اسلام، لاہور۔

محمد حسین — سید مودودی کے تعلیمی نظریات ۔ لاہور، ۱۹۷۶ء
محمد خلیل اللہ — اعلیٰ تعلیم میں تسلسل و تبدل
محمد بن سعد الرشید — آج عالمِ اسلام کی نگاہیں پاکستان پر لگی ہوئی ہیں۔ مشمولہ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید، لاہور۔ ۱۹۷۹ء
محمد طاسین — اسلامی نظامِ تعلیم کا مفہوم و مطلب
محمد سعید الرحمٰن علوی — تعلیمی نظام میں وسیع تبدیلیوں کی ضرورت ۔
محمد سلیم سید پروفیسر — بے علم نتواں خدا را شناخت ۔
محمد قطب الستاذ — موجودہ نظامِ تعلیم سے اسلامی نظامِ تعلیم کی طرف۔ مشمولہ نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید، تنظیم اساتذہ پاکستان، لاہور، ۱۹۷۹ء
معین الدین ڈاکٹر — قرآن کریم کا نظریۂ علم
محمد یوسف بنوری مولانا — پس چہ باید کرد
مناظر احسن گیلانی سید — مسلمانوں کا نظامِ تعلیم و تربیت
مودودی ابوالاعلیٰ — معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز، نظامِ تعلیم کی اسلامی تشکیلِ جدید، لاہور ۱۹۷۹ء
مودودی ابوالاعلیٰ — تنقیحات
مودودی ابوالاعلیٰ — اسلامی نظامِ تعلیم، لاہور، ۱۹۷۴ء
ناصر شیرازی — قائداعظم کے تعلیمی افکار
جسٹس نذیر الدین احمد — تعلیم کا مسئلہ حل کیوں نہیں ہوتا ۔
وحید الدین خان — علومِ اسلامی کی تدوین
وحید قریشی ڈاکٹر — قرآن کریم کی روشنی میں تعلیم

رسائل و مسائل

قرآن مجید اور وحی خفی

جناب ملک غلام علی صاحب مدیر شعبہ علمیہ ۔ منصورہ

سوال:۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ پایا جاتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دو قسم کی وحی ملا کرتی تھی ۔ ایک قسم کی وحی وہ جو جبریل امین کی وساطت سے آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملتی تھی، اس کے الفاظ بھی خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتے تھے ۔ اس طرح کی کئی ساری وحیوں کا مجموعہ قرآن ہے اور آنحضورؐ اس بات کے مکلف تھے کہ وہ اس قسم کی وحی کو بلا کم وکاست انہی الفاظ میں عام لوگوں تک پہنچا دیں جن الفاظ میں وہ وحی اُن کو ملتی تھی ۔ اُسے وحی جلی کہا جاتا ہے ۔ چونکہ اس قسم کے وحیوں کے مجموعہ (قرآن) کی تلاوت کی جاتی ہے اور حضورؐ کے زمانے میں بھی کی جاتی تھی لہٰذا اُسے وحی متلو بھی کہتے ہیں اور چونکہ اس قسم کی وحی کو ساتھ کے ساتھ لکھ لیا جاتا تھا لہٰذا اس کا تیسرا نام وحی مکتوب ہوا ۔

دوسری قسم کی وحی محض حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کے لیے ہوتی تھی ، وہ بلا واسطہ جبریل ، براہ راست ملتی تھی ، اس کے الفاظ خدا تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوتے تھے ، اس کی تلاوت بھی پہلی قسم کی وحی کی طرح نہ کی جاتی تھی اور اُسے ساتھ کے ساتھ لکھا بھی نہ جاتا تھا اس قسم کی وحی آنحضورؐ کے اقوال و افعال کے ذریعے سے عام لوگوں تک پہنچتی تھی ، اسے وحی خفی وحی غیر متلو یا وحی غیر مکتوب کہا جاتا ہے ۔

آیئے دیکھیں کہ قرآن مجید اس بارے میں کیا کہتا ہے ۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ شوریٰ میں بیان فرمایا ہے کہ وہ انسانوں کے ساتھ کس کس انداز

سے کلام کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ۔

"کسی بشر کے لیے یہ نہیں ہے کہ اللہ اس سے گفتگو کرے، مگر وحی کے طریقہ پر، یا پردے کے پیچھے سے، یا اس طرح کہ ایک پیغامبر بھیجے۔ اور وہ اللہ کے اذن سے وحی کرے جو کچھ اللہ چاہتا ہو۔ وہ برتر اور حکیم ہے"۔ (۴۲/۵۱)

ترجمہ کے یہ الفاظ سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم کے ہیں۔

اس آیت کی تفسیر کرتے وقت عموماً یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی بشر پر احکام و ہدایات نازل ہونے کی تین صورتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک براہِ راست وحی یعنی القاء والہام، دوسرے پردے کے پیچھے سے کلام، تیسرے اللہ کے پیغام بر (فرشتے) کے ذریعے سے وحی۔ قرآن کریم میں جو وحیاں جمع کی گئی ہیں وہ ان میں سے صرف تیسری قسم کی ہیں۔ اس کی تصریح اللہ تعالیٰ نے آیات (۲/۹۷-۹۸) اور آیات (۲۶/۱۹۱-۱۹۴) میں خود ہی کر دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ رسول کو ہدایات ملنے کی باقی دو صورتیں جن کا ذکر آیت نمبر (۴۲/۵۱) میں کیا گیا ہے۔ وہ قرآن مجید کے علاوہ ہیں۔ اور اس بات کی مزید تائید کے لیے قرآن کریم کی چند آیات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ یوں وحی خفی کا عقیدہ رکھنے والوں کے نزدیک اس قسم کی وحی کے وجود کا ثبوت بنص صریح پایۂ تکمیل کو پہنچ جاتا ہے۔

آیت (۴۲/۵۱) کی تفسیر کا جو خلاصہ میں نے اوپر لکھا ہے۔ اس میں چند بنیادی اور دُور رس نتائج کی حامل غلطیاں ہیں۔

۱۔۔ پہلی غلطی یہ ہے کہ اس آیت جلیلہ میں لفظ رسول سے ملکِ رسول مراد لیا گیا ہے۔ حالانکہ اس لفظِ رسول سے مراد بشر رسول ہے۔

۲۔۔ دوسری غلطی یہ ہے کہ یہ مفروضہ قائم کر لیا گیا ہے کہ اس آیت میں محض نبیؐ رسول کے ساتھ ہی خدا تعالیٰ نے اپنے کلام کرنے کے طرق کا ذکر فرمایا ہے اور اس میں عام انسانوں کے ساتھ خدا تعالیٰ کے کلام کرنے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حالانکہ تمام انسانوں کے ساتھ خدا کے کلام

کرنے کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۳۔ تیسری غلطی یہ ہے کہ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ میں فَیُوْحِیَ کا فاعل رسول کو قرار دیا گیا ہے حالانکہ فَیُوْحِیَ کا فاعل اللہ ہے، رسول نہیں ہے۔

قرآن مجید کو اللہ تعالیٰ نے کتاب مبین کہا ہے۔ اس نے خود بتایا ہے کہ کس جگہ لفظ رسول سے مراد ملک رسول ہے اور کس جگہ بشر رسول۔ قرآن کریم کا قاعدہ کلیہ اور اسلوب بیان یہ ہے کہ ملک رسولوں کو "نازل کرتا ہے اور بشر رسول کو "ارسال" کرتا ہے۔ "نزولِ ملائکہ" اور "ارسالِ رسل" گویا قرآن مجید کی اصطلاحات ہیں۔

ایک لفظ اِلقاء بھی وحی خفی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ اور یہ لفظ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ آپ اس کے استعمال کے سارے قرآنی مواقع دیکھ لیں۔ آپ کو پورے قرآن مجید میں اس کا استعمال وحی غیر متلو کے معنوں میں نہ ملے گا۔ بلکہ آنحضورؐ کو قرآن پاک ملنے کے معنی میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ وَاِنَّكَ لَتُلَقَّى الْقُرْاٰنَ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ عَلِيْمٍ (۲۷/۶) "اور تجھ کو قرآن ایک حکمت والے خبردار (خدا) کی طرف سے القاء کیا جاتا ہے۔

جو کچھ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتی بصیرتِ علمی سے ماوراء تھا۔ اور اس کی کارِ نبوت کے لیے علمی سطح پر ضرورت بھی تھی۔ وہ سب کچھ انہیں کتاب کے ذریعے سے دے دیا گیا۔ یہ کتاب کافی ہے۔ علاوہ ازیں کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے، وحی خفی کی بھی نہیں۔

جواب:۔ آپ جس عقیدے کی تردید کرنے چلے ہیں۔ میں خود اس کا قائل ہوں۔ اور اس کا انحصار فقط ایک آیت پر نہیں ہے بلکہ بہت سی دوسری نصوص کتاب وسنت سے بھی یہ میرے نزدیک ثابت ہے۔ قرآن مجید یا دیگر کتب سماویہ کے علاوہ بھی وحی انبیاء علیہم السلام پر نازل ہوتی تھی۔ اور وہ بھی وحی نبوت کی ایک قسم ہے۔ خواہ اس کو کسی اصطلاحی نام سے تعبیر کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ ہر حالت میں غیر ملفوظ یا فرشتے کی وساطت کے بغیر ہوتی تھی۔ وہ الفاظ پر بھی مشتمل ہو سکتی تھی یا بالخصوص جب کوئی فرشتہ اسے لے کر آتا تھا تو لازماً وہ الفاظ ہی کی شکل میں اسے پہنچاتا ہوگا۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ وہ ہمیشہ انبیاء کی ذاتی رہنمائی کے لیے ہوتی تھی۔ بسا اوقات اس میں نبی یا اس

کے متبعین کے لیے تبشیر، تنذیر یا تثبیت و تسکین کا پہلو ہوتا ہے۔ بعض اوقات اس میں انبیاء یا اُن کے متبعین کے لیے رہنمائی اور امر و نہی کا پہلو بھی ہوتا ہے۔ پھر یہ وحی خواب کی شکل میں بھی ہوتی تھی، جیسا کہ قرآن و حدیث کے متعدد مقامات سے ثابت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ کو بیٹا قربان کرنے کا حکم خواب کے ذریعے دیا گیا۔ جو فی الحقیقت واجب التعمیل تھا۔ اور دونوں باپ بیٹوں نے ایسے ایسا ہی یقین کیا۔ غیر نبی کے خواب کی یہ دینی و شرعی حیثیت کبھی نہیں ہو سکتی کہ اس کی بنا پر کوئی باپ بیٹے کو ذبح کرنے کے لیے اور بیٹا ذبح ہونے کے لیے مکلّف و آمادہ ہو جائے۔ صحیحین اور دوسری کتابوں میں حضرت عائشہؓ اور دوسرے صحابہ کرام سے متعدد احادیث مروی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کی ابتدا سچے خوابوں کی شکل میں ہوئی جن کی تعبیر فلقِ صبح کی طرح بالکل عیاں ہو جاتی تھی۔ اگر آپ کچھ لوگوں کی طرح اس بات کے قائل ہیں کہ یہ دوسری وحی جو ہمارے پاس حدیث و سنّت کی شکل میں موجود ہے۔ وہ محض اساطیر اور قصّے کہانیاں ہیں اور اُن میں کوئی شے واجب الاتباع نہیں ہے تو مجھے آپ سے کوئی سروکار نہیں ہے اور آپ جو چاہیں لکھتے رہیں۔ لیکن اگر آپ کا یہ عقیدہ نہیں ہے تو پھر خواہ مخواہ آپ اس لاطائل بحث میں کیوں اپنے آپ کو اور دوسروں کو اُلجھانا چاہتے ہیں۔ میرا عقیدہ یہی ہے کہ وحیِ نبوت مکتوب بھی ہوتی ہے اور غیر مکتوب بھی اور ایک مسلمان کے لیے دونوں دینی لحاظ سے حجت و سند ہیں۔

جہاں تک سورہ شوریٰ کی آیت مذکورہ کا تعلق ہے اُس کا جو ترجمہ مولانا مودودی مرحوم نے بیان فرمایا ہے میرے نزدیک وہی صحیح اور قابلِ ترجیح ہے۔ بیشتر علما و مفسرین نے اس کا مفہوم یہی بیان فرمایا ہے۔ اگرچہ بعض نے یرسل رسولاً سے انسانی پیغمبر بھی مراد لیا ہے۔ لیکن میرے نزدیک یہاں فرشتہ ہی مراد ہے۔ ملائکہ کے لیے رسول اور رسل کا لفظ قرآن مجید میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے، اور ظاہر ہے کہ جب فرشتے کے لیے بھی رسول کا لفظ استعمال ہو گا۔ اور وہ پیغام بر کی حیثیت سے آئے گا اور اس کے لیے ارسال کے فعل کا استعمال بھی بالکل صحیح ہو گا اور یرسل رسولاً سے مراد پیغام بر کا ارسال کرنا ہو گا۔ میری سمجھ میں نہیں آتا ہے کہ اس میں اشکال و اعتراض کا کیا پہلو ہے۔ فرشتہ اگر رسول کی حیثیت سے آ رہا ہے تو اس کے لیے ارسال کا صیغہ آخر کیوں نہیں آ سکتا؟

آپ کی طویل و عریض بحث میں ایک چیز جو میں نے خاص طور پر دیکھی ہے وہ یہ ہے کہ اپنے بہت سے استدلالات و مزعومات کو آپ ایسے قواعد کلیہ کے طور پر بیان کر دیتے ہیں کہ گویا ان میں سے کوئی استثنا نہیں ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے خلاف ہوتی ہے۔ مثلاً آپ کہتے ہیں کہ پورے قرآن مجید میں القاء یا تلقی کا استعمال وحی غیر متلو کے لیے نہیں ہوا۔ حالانکہ یہ لفظ ہر طرح کے القا اور تلقی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ خواہ وہ رحمانی ہو یا انسانی حتیٰ کہ شیطانی ہو۔ تلقی کا لفظ بھی حضرت آدم کے جنت کے قیام کے ذکر میں فرمایا گیا۔ جب وہ منصب نبوت پر فائز نہیں تھے۔ "فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ" (البقرہ - ۳۷) اسی طرح فرمایا۔ اِذْ تَلَقَّوْنَهٗ بِاَلْسِنَتِكُمْ (النور ۱۵) اسی طرح فرمایا "اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ"۔ (قٓ - ۱۷) ۔ اسی طرح آپ کا یہ خیال بھی صحیح نہیں ہے کہ ملائکہ کے لیے ہمیشہ نزول یا اس مادے کے دوسرے مشتقات ہی استعمال ہو سکتے ہیں ــــ فرشتوں کے لیے جَآءَ اور جَآءَتْ کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں اور ارسل کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ اس لیے آپ یہ خواہ مخواہ کا غلط ادعا کر رہے ہیں اور اس سے جو بات آپ ثابت کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ثابت نہیں ہوتی اور اس کا خلاف کتاب و سنّت کی متعدد نصوص سے ثابت ہے۔

سجدۂ شکرانہ

(ادارہ)

سوال:۔ رجم کے متعلق حال ہی میں جو غیر متفقہ عدالتی فیصلہ سامنے آیا ہے اس پر طلوعِ اسلام کا ایک اقتباس بہ عنوان "سجدۂ شکرانہ" پیش خدمت ہے۔

"**سجدۂ شکرانہ**: یہ پرچہ پریس میں جا رہا تھا کہ روزنامہ نوائے وقت لاہور کی اشاعت میں یہ ایمان افروز خبر، وجہِ قرۃِ دیدہ ہوئی کہ:۔

وفاقی شرعی عدالت نے رجم کو اسلامی تعلیمات کے منافی قرار دے دیا۔

تفصیل اس کی یوں درج ہے کہ:ــــ اسلام آباد ۲۱ مارچ (پ پ ا) وفاقی شرعی عدالت

نے آج کثرت رائے سے فیصلہ سنایا ہے کہ رجم یعنی سنگسار کر کے ہلاک کر دینا حد نہیں۔ یہ فیصلہ مسٹر جسٹس (ریٹائرڈ) صلاح الدین احمد (چیئرمین)، مسٹر جسٹس آغا عبدالعلی، مسٹر جسٹس شیخ آفتاب حسین، مسٹر جسٹس ذکاء اللہ لودھی، اور مسٹر جسٹس کریم اللہ درانی (ارکان) نے دو درخواستوں پر سنایا ہے۔ یہ درخواستیں لاہور کے مسٹر حضور بخش، مسٹر ایم۔ آئی چودھری نے دائر کی تھیں، جن میں کہا گیا تھا کہ نفاذِ حدود آرڈیننس مجریہ ۱۹۷۹ء کے مطابق رجم یا سنگساری، اسلامی احکام کے منافی ہیں۔ فاضل عدالت کے تین ججوں نے فیصلہ دیا کہ رجم حد نہیں۔ جب کہ جسٹس شیخ آفتاب حسین نے قرار دیا کہ یہ فیصلہ تعزیر کے مطابق ہے تاہم مسٹر جسٹس کریم اللہ درانی نے اس فیصلے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا کہ رجم حد ہے۔ عدالت کے اعلان کے مطابق اس فیصلے کا اطلاق اس سال ۳۱ جولائی سے ہوگا۔ اس وقت تک آئین کے تحت حکومت قانون میں ضروری ترمیم کرے گی تاکہ اس قانون کو وفاقی شرعی عدالت کے مطابق بنایا جا سکے۔"

اب اس پر جذباتِ مسرت کا وجد ان لفظوں سے ظاہر ہوتا ہے،

"ہم سب سے پہلے بحضور رب العزت سجدہ ریز ہیں جس نے ہماری ناچیز سی کوششوں کو شرفِ قبولیت عطا فرمایا۔ اس کے بعد ہم محترم حضور بخش اور ایم۔ آئی چودھری دیگر حضرات کو جنہوں نے اس باب میں کوشش فرمائی مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں اور شرعی وفاقی عدالت کی خدمت میں ہدیۂ تبریک و تہنیت پیش کرتے ہیں جنہوں نے اس اولوالعزمانہ فیصلہ سے قرآن مجید کی برتری کو ثبت کر کے، اسلام کو دنیا میں سر اٹھا کر چلنے کے قابل بنا دیا۔ فَجَزَاهُمُ اللّٰهُ اَحْسَنَ الْجَزَاء۔"

کچھ اس کے متعلق آپ بھی اظہار رائے کریں گے۔

جواب:

کچھ ایسا اظہار رائے کا مقام تو نہیں ہے اگر آپ نے جب بطور خاص اسے اٹھا کر میرے سامنے لا رکھا ہے تو تھوڑی سی دلچسپی لینے میں کچھ حرج بھی نہیں۔

پہلی بات تو میں یہ کہتا ہوں کہ اس شذرے کا اختتامی حصہ پڑھتے ہی خیال آتا ہے کہ حدِ رجم کے خلاف حالیہ فیصلہ صادر ہونے سے پہلے دنیا میں اسلام (نعوذ باللہ) بڑا شرمسار اور سرنگوں رہا ہوگا بلکہ گھسٹ اور رینگ کر چلتا ہوگا۔ دورِ نبوتؐ ہو یا دورِ خلافتِ راشدہ، اموی سلطنت ہو یا عباسی، فاطمی دور ہو یا عثمانی، مسلمانوں کی گردن دنیا کے سامنے بہت دبتی ہوگی، بیچارے احساسِ کمتری کی وجہ سے بات بھی نہ کر سکتے ہوں گے۔ تبلیغِ اسلام کی جرأت تو اور بھی مشکل ہے۔ کوئی شخص اسلام لاتا بھی نہ ہوگا۔

شاید یہی وہ کمزوری ہوگی کہ جس نے ہماری سلطنتوں کو سرنگوں کر دیا اور جگہ جگہ غلامی کی رات چھا گئی اور اب تو بس پہلی بار اسلام کا سر ایسا اونچا ہوا ہے کہ وہ مشرق و مغرب کے انسانوں کو پلک جھپکنے میں مفتوح کر لے گا۔

بالفاظِ دیگر، اسلام سر اٹھا کر چلنے کے لیے "ہماری" —— یعنی منکرینِ سنّت کی "تئیس سالہ کوششوں" کے نتیجہ خیز ہونے کا منتظر تھا۔

دوسری بات یہ کہ ہمارے یہاں اسلام (یعنی کتاب و سنّت والا اسلام) کے ملے ہیں، کیا بلحاظ دستور اور کیا بلحاظ ملّت کے اکثریتی نقطۂ نظر کے اور کیا بلحاظ جملہ مدارسِ فکر کے علماء کے اجماع کے۔ پس وقتی فیصلے کچھ بھی ہوا کریں، آخر کار بات کو لوٹ کے کتاب و سنّت والے اسلام ہی پر پہنچنا ہے۔ انکارِ سنّت والے اسلام پر نہیں۔ ایک اقلیتی نقطۂ نظر کے لیے کچھ لوگ پبلسٹی کا طوفان اٹھائیں۔ یا اندرون و خارج اپنے حلقے بنالیں اور فکرِ مغرب کے اسیروں کو "اسلام میڈ ایزی" کے طلسم سے تسکین پہنچا کر انہیں زیرِ اثر کر لیں۔ اُن کا عقیدۂ خاص اکثریتی نقطۂ نظر نہیں بن سکتا۔ کیونکہ ایک جزوی معاملے میں اس کے اطلاق سے اس کی پوری خرابیاں سامنے نہیں آتیں۔ مگر سارے اسلام کے سارے نظامِ عبادات و معاملات پر ترکِ سنّت کا اصول پھیلایا جائے تو اصل بات کھلتی ہے کہ دین کے تمام ادارے اور تمام ہیئتیں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اور فکری اختلافات کے بیسیوں راستے ہر مسئلے میں نکل آتے ہیں۔ وہ تو سنّت نے ہر معاملے میں (DIMENSIONS اور DIRECTIONS) کو متعین کر دیا ہے جس کی وجہ سے لاطائل اختلافات کے راستے بند ہو جاتے ہیں، صرف اجتہاد و استنباط کی راہیں کھلی رہتی ہیں۔

تو میں جناب مستفسر سے عرض کروں گا کہ ہمارے ہاں جو گروہ اکثریت کے خلاف مراصد میں گھات لگا کے بیٹھتے ہیں اور پھر جب اُن کا کوئی وار کاری لگ جاتا ہے تو اُس پر خوشی مناکر اکثریت کو چڑاتے ہیں، وہ کسی نہ کسی وقت اس طفلانہ کھیل کا خمیازہ بھگتیں گے۔ اُن کی حالیہ کامیابی رائے عام اور علماء کی بحثوں کے نتیجے میں پیدا نہیں ہوئی، بلکہ اوپر سے وارد ہوئی ہے۔

تیسری گذارش یہ ہے کہ یہ کچھ اچھا اسلوب نہیں ہے کہ ایک معزز عدالتی بنچ کے فیصلے میں جن ججوں کی آراء آپ کو پسند آئی ہیں۔ اُن کے ناموں کو الگ سے نمایاں کر کے آپ اُن کو مبارکباد دیں (اگرچہ شرطِ ادب پوری کرنے کے لیے بعد میں پوری عدالت کے لیے بھی مبارکباد کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں) نیز اُن کے بارے میں خطوطِ وحدانی کے اندر "جنہوں نے اس باب میں کوشش فرمائی" کے الفاظ بھی خواہ مخواہ سوال پیدا کرتے ہیں کہ آیا مسئلے کو سوچنے اور فیصلہ لکھنے کے علاوہ بھی کسی طرح کی تکلیف اٹھانا مراد ہے۔ کیونکہ اوپر "ہماری تیس سالہ کوششوں" کے الفاظ میں کوشش کا ایک خاص تصور ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ ججوں کے متعلق ایسے ذومعنی الفاظ اور انداز سے اظہارِ تحسین اچھا نہیں لگتا آخر کوشش تو اُن ججوں نے بھی فرمائی جنہوں نے اختلافی فیصلہ لکھا۔ اُن کے متعلق نام لے کر الگ سے آپ نے دادِ سند نہیں فرمائی۔

شاید فوری مسرت کے دباؤ کی وجہ سے اس طرح کا ذہنی عدم توازن پیدا ہو گیا ہو۔

(ن ۔ ص)

مطبوعات

FREEDOM FOR QURAN
مؤلف: احمد نواز
ضخامت ۲۴۱ صفحات مجلد
قیمت: ۱۵/- روپے
پبلشر اور ملنے کا پتہ نامعلوم

عرصے کے بعد ایک دلچسپ کتاب سامنے آئی ہے۔ تبصرے کی کتابوں کا سارا ڈھیر چھوڑ کر پہلا نمبر اسے دیا۔ پڑھا تو یوں لگا جیسے کوئی ذہین بچہ "پکسو" سے کھیل رہا ہو۔

کتاب کا مقصد تمہیدی صفحے میں یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کو (اس معنی میں) آزاد کرایا جائے کہ خدائی احکام کی توضیح خود قرآن ہی سے ہو جاتی ہے..... باقی ہر چیز انسانی چرب زبانی ہے۔ بعد کے مضمون میں قرآن کو انسانی مداخلت (HUMAN TOUCH) سے تحفظ دلانے کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں۔

مگر سوال یہ ہے کہ آیا دو سو اکتالیس صفحے کی یہ کتاب خود قرآن کے متعلق انسانی کاوشوں پر مشتمل نہیں ہے؟ اور اس میں تفسیر و توضیح نہیں کی گئی ہے؟ جا بجا فرمایا کہ فلاں لفظ کو سمجھنے کے لیے فلاں حصۂ قرآن دیکھیے۔ اور فلاں آیت کی تشریح فلاں کی مدد سے کیجیے۔ پھر کہیں اپنے اقتصادی موضوعات اور کہیں معروف سائنسی بحثوں کا سانچا بنا کر قرآنی آیات و اصطلاحات کو ان میں ڈھال دیا ہے۔ کمال تو یہ ہے کہ مارکس اور سارتر اور کئی دوسرے مغربی عالموں کے حوالوں سے قرآن کی وضاحت کی گئی ہے ——

دریافت طلب یہ ہے کہ اگر قرآن کے احکام اور بیانات اور مطالب پر کسی انسان (حتّٰی کہ خدا کے رسولؐ) کو بھی کلام کرنے کا حق نہیں ہے تو یہ حق آپ کے لیے کہاں سے برآمد ہوا؟ قرآن جانے اور قرآن کے پڑھنے والے جانیں۔ وہ جس آیت یا اصطلاح کا مفہوم جو چاہیں اختیار کریں اور جس حصے کو جس دوسرے حصے کی مدد سے چاہیں سمجھیں۔ آپ بیچ میں بولنے والے آپ کون؟ جس جرم کا مجرم آپ نے (نعوذ باللہ) پیغمبر سے لے کر تمام صحابہ و اسلاف تک کو بنا ڈالا اور اس ناوک کی زد سے کوئی مرغ قبلہ نما بھی نہ بچ سکا۔ خود اسی کے مرتکب ہو کر آپ نے سامنے آنے کی جرأت کیسے کی ہے؟ دیانت داری کا تقاضا یہ ہے کہ

اپنی اس کتاب کو واپس لیجیے اور دستِ مبارک سے خود ہی چولہے میں جھونک دیجیے۔ ورنہ دیگراں را نصیحت کر کے خود میاں فضیحت بننے سے بات اور بگڑے گی۔[۱]

افسوس کہ میرے پاس صفحات کم ہیں اور یہ کتاب ہر صفحے پر ایسے کرشمے رکھتی ہے کہ دل کہتا ہے کہ جا ایں جاست! آخر ہر نکتہ لطیف پر کیسے بحث کی جا سکتی ہے۔ بس چند مختصر گذارشات!

صفحہ ۲ پر بڑے طنزیہ انداز میں قرآن کی آیت (۶۲—۵) کو چسپاں کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ ہمیں تو تاکید کی گئی تھی کہ تم انبارِ کتب سے لدے ہوئے گدھے نہ بننا۔ (ص ۲)

اصل آیت پر تو گویا نظر ہی نہیں۔" ڈاکٹرز آف انڈکس" جب قرآن کی آیات اِدھر اور اُدھر سے نکال کر تشریح کرتے ہیں تو بڑے لطائف پیدا ہوتے ہیں۔ آیت جس کا حوالہ دیا گیا ہے اُسے سورۂ جمعہ میں ملاحظہ فرمایئے۔ کہا یہ گیا ہے کہ جن لوگوں کو توراۃ کا بار اُٹھوایا گیا تھا، انہوں نے بعد میں اسے (حقیقت میں) اُٹھا کر نہیں دیا۔ اُن کی مثال اُس گدھے کی سی ہے جس پر کتابیں لدی ہوں (کہ وہ نہ اُن کو سمجھ سکے اور نہ اُن پر عمل کرے)۔ یعنی تورات کو انہوں نے خدا کی کتاب کی حیثیت سے اُٹھا تو لیا، مگر نہ اُس سے رہنمائی حاصل کی اور نہ اُس پر عمل کیا۔ اسی بات کو قرآن نے ایک دوسرے انداز سے سورۂ مائدہ میں پیش کیا۔ آیت ۶۸ میں کہا گیا ہے کہ اے اہلِ کتاب تمہارا کوئی موقف نہیں ہے اُس وقت تک جب تک تم تورات اور انجیل کو اپنی زندگیوں میں عملاً قائم اور نافذ نہ کرو۔ پیچھے آیت ۶۶ میں یہ بھی کہہ دیا کہ اگر وہ تورات و انجیل پر عمل کرتے تو وہ تحت و فوق سے رزق پاتے۔ کمزور سلوگنی گفتگو آپ کے پورے تلبیس کو ساقط الاعتبار نہ کر دے۔

مگر احمد نواز صاحب نے اپنے تحفظ کے لیے راہِ استثنیٰ نکال لی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ میری باتیں

---

[۱] یہاں آپ کے کچھ ہم نوا اور بھی ہیں۔ ان سب کی کتابوں اور رسائل کو جمع کیا جائے تو بات انبار تک محدود نہیں رہتی بلکہ انہیں اُٹھوانے کے لیے کسی ٹرک کار کی خدمات لینی پڑیں گی اور پھر اُوپر معتزلہ اور خوارج میں سے جن لوگوں نے "خالص قرآن" اور "فقط قرآن" کا نعرہ لگایا تھا اُن کی لکھی ہوئی تفسیریں اور کتابیں بھی بڑی بڑی ہیں۔ وہ سارا حساب آپ ہی کے کھاتے میں ہے، اور آپ ہی جائز وارث ہیں۔ کیا خیال ہے ان انسانی نگارشات کے متعلق!

کسی پیشہ ور مذہبی پیشوا کی تخلیق نہیں ہیں، اس لیے میرے پیغام کو مسترد نہ کیا جائے - اب ایک اور مسئلہ پیدا ہو گیا کہ پیشہ ور مذہبی پیشوا اگر قرآن کی کوئی تشریح کرے یا دین کا تصور پیش کرے تو مسترد، اور غیر پیشہ ور کرے تو واجب القبول - بلکہ پوری نفی تو یوں ہوتی ہے "غیر پیشہ ور، غیر مذہبی، غیر پیشوا" مگر صاحب کون کہہ سکتا ہے کہ اس کتاب کے لکھنے کے بعد آپ اچھے خاصے دینی مفکر اور مدبر نہیں مانے جائیں گے اور دو چار اور کتابیں لکھ کر پیشہ ور نہیں بن جائیں گے - سوال یہ بھی ہے کہ سلف کے جن بزرگوں پر اعتراض ہے ان کے متعلق آپ کو ثابت کرنا ہو گا کہ پیشہ ور مذہبی پیشوا کون کون تھے -

یوں بھی ہم جاننا چاہتے ہیں کہ دنیا میں کونسا علم، کونسا قانون اور کون سا مذہب یا ازم ایسا ہے کہ جس کے متعلق کتابوں کے انبار موجود نہ ہوں - کیا اقتصادیات، نفسیات، سائنس و تعلیم پر ہزاروں کتابیں موجود نہیں ہیں؟ شیکسپیئر اور ملٹن اور اقبال اور غالب کے بارے میں الماریوں تحریریں لکھی گئی ہیں صرف رومن امپائر، صرف بغداد اور صرف جنگِ عظیم I و II پر بے شمار لٹریچر ہے - پھر یہ کیسے قابل تصور بات ہے کہ خدا کا ایک پیغمبر اٹھے، ۲۳ سال انقلابی کام کرے - جنگیں لڑے، نظام چلائے اور خاص اس دائرے کو علم اور فکر سے خالی رکھا جائے - کوئی ریکارڈ نہ ہو، کسی بحث کا ذکر نہ ہو، کوئی سوالات نہ اٹھے ہوں، اور جواب نہ دیے گئے ہوں، قرآن کے متعلق زبانیں بند رکھی گئی ہوں اور مسائل دین میں قلموں کے راہواروں کو کھونٹے سے باندھ دیا گیا ہو کیا لا یعنی بات ہے -

پیدائش انسان یا قصہ آدمؑ کے بارے میں ص ۱۵، ۸۰، ۸۱، ۸۸ کو دیکھنے سے معلوم ہوا کہ انسان کی تخلیق مروجہ نظریۂ ارتقاء کے مطابق ہوئی ہے - (حالانکہ خود اس نظریے پر مغربی داناؤں کا اتفاق نہیں ہے) اور آدم کی ساخت اور نفخ روح اور لَا تَقۡرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ کی مناہی، پھر اهبطوا کا حکم وغیرہ سب کچھ اسی زمین پر ہوا ہے - باقی باتیں قرآن میں انسانی مداخلت ہیں - مگر ہم مؤلف کتاب سے پوچھتے ہیں کہ نظریہ تخلیق کے متعلق جو نکات صفحہ در صفحہ آپ نے جس شکل میں بیان فرمائے ہیں، وہ قرآن نے کہاں دیے ہیں؟ آپ قرآن کے چند الفاظ کو لیتے ہیں اور پھر اپنے نتائجِ تدبر تفصیل سے بیان فرمانے لگتے ہیں - ایک اور دلچسپ نکتہ - حضرت نوحؑ کی قوم کا غرقِ طوفان ہونا یہ معنی رکھتا تھا کہ ان لوگوں نے من مانا سماجی اقتصادی نظام اختیار کر لیا - سو وہ جدید اصطلاح کے مطابق اقتصادی بلبلے کے پھٹنے (BURSTING OF ECONOMIC BUBBLE) سے تباہ ہو گئے (ص ۸۱) - پھر سورہ دھر کی طرف توجہ منعطف ہوتی

ہے۔ آیت ۱۱ میں ہے۔ فَوَقٰہُمُ اللّٰہُ شَرَّ ذٰلِکَ الْیَوْمِ ...... یعنی بچا لیا اللہ نے ان کو اس یوم (قیامت) کے شر سے۔ اس "یوم" کی تشریح کرنے کے لیے انقلاب فرانس اور سوویت انقلاب (کے دنوں) کی مثال پیش کی گئی۔ (ص ۸۳) بہت سے مقامات پر قیامت، جہنم اور جنت کا معاملہ اسی طرح گول کر دیا گیا ہے

مذہبی لوگوں پر غیظ و غضب کا ایک چھینٹا ص ۴۲ پر یوں ڈالا گیا ہے کہ "جب تم دنیا میں آتے ہو تو یہی لوگ سب سے پہلے تمہارے سکون میں مخل ہوتے ہیں" (یعنی اذان کہتے ہیں) "اور سب سے آخری ہوتے ہیں جو تمہیں مرنے کے بعد آرام کے لیے چھوڑتے ہیں" یعنی جنازہ پڑھتے ہیں۔ اور "یہ لوگ بچوں کو ختنے کی اذیت میں ڈالتے ہیں، گویا کہ خالق نے اپنے کام میں کوئی غلطی کر دی ہے"۔ مجھے یاد آیا کہ بچپن میں یہ آخری دلیل سکھوں سے سنا کرتے تھے کہ تم لوگ فطرت میں خلل ڈالتے ہو۔ جہاں دایہ کی زچہ گیری اور زچہ و بچہ کے آخری جسمانی تعلق کو ختم کرنا، بلکہ ناخن اور بال ترشوانا، حتیٰ کہ خدا کے بے لباس پیدا کردہ جسم کو لباس میں لپیٹنا ان "قرآنیوں" کے فلسفے کی رو سے (نعوذ باللہ) خدا کے کار ناتمام کی تکمیل ہے یا پھر اصلاح۔

عبادات کا تصور بھی خوب ہے۔ صفحہ ۵۲ پر نماز کی شان میں فرمایا کہ "ہماری نماز صحت و صفائی کے لیے ضروری ہے۔ سجدے میں ہوں تو قلب سے دباؤ ہٹ جاتا ہے۔ بیٹھیں (قعدہ میں) تو زیریں حصہ بدن کے جسم کی رگوں میں خون دوڑتا ہے۔ اور اس ورزش کی وجہ سے وہ پھولتے نہیں بلکہ لچکدار رہتے ہیں (۵۲) حرام ہے جو کوئی ذکر تقویٰ یا روحانیت وغیرہ کا ہو۔ ص ۸۴، ۸۵ پر مسئلہ قربانی پر چھری چلائی گئی ہے۔

لیجیے صدقات کی تعریف بھی سن لیجیے "یہ وہ ادائیگیاں ہیں جو بعض ذمہ داریوں کو پورا کرنے کے لیے کی جاتی ہیں۔ جیسا کہ محنتانہ، حصہ دارانہ منافع یا بل کی ادائیگی وغیرہ"۔ اور زکوٰۃ؟ "اقتصادی ترقی کے لیے ایسی ادائیگیاں جو سرمایہ کاری (INVESTMENT) کی صورت میں پوری ہوں گی (ص ۱۰)"

معراج النبی کا بیان بھی ملاحظہ ہو۔ انسان کے من گھڑت افسانوی ڈھکوسلوں کی مثال دیتے ہوئے (ص ۵۰) فرمایا کہ "ایک شخص آسمانوں پر جاتا ہے اور وہاں سے وہ قرآن کے علاوہ بھی کچھ خدائی ہدایات لے کر آتا ہے"۔

ابھی آدھی سے زیادہ کتاب باقی ہے جس میں "بے آمیز قرآنی دین" کے مسائل کی بے شمار دلچسپیاں اور لطائف دامنِ توجہ کھینچتے ہیں۔ خصوصاً مرتد کی بحث بڑی ماہرانہ ہے۔ بات ختم کرنے سے پہلے صرف ایک بنیادی تصور۔ مؤلف نے قرآنی جیومیٹری کے تحت ایک "مثلثِ دروغ" دریافت کی ہے۔ اس کے تین اضلاع یہ ہیں:- ۱- احادیث ۲- تفاسیر ۳- سیرت۔ (ص ۳۰) قرآن اس مثلث میں بند ہے (باقی بر صفحہ ۱۸)

(بقیہ اشارات) تحفظ و احصان حاصل ہے۔ لہٰذا اگر وہ اُسے توڑ کر جرم کرتی ہے تو سزا پہلی صورت سے دُگنی ہوگی اور یہی عام معیاری سزا ہے۔ تیسری صورت میں چونکہ خاندان اور نکاح کی دو قلعہ بندیوں کو توڑ کر مجرمہ جرم کرتی ہے۔ اور یہ عبارتِ جرم غیر معمولی درجے کی ہے (اور اس پر شہادت بھی غیر معمولی درجے کی لی جاتی ہے) لہٰذا سزا رجم ہے۔ اسی طرح غیر شادی شدہ مرد اور شادی شدہ مرد کے معاملے میں فرق ہے۔ جن لوگوں نے نکاح سے پہلے کی حالتِ احصان کو نہیں سمجھا، اور خاندانی احصان اور نکاحی احصان میں فرق نہیں کیا۔ انہوں نے خاندانی منکوحہ اور خاندانی غیر منکوحہ عورت یا مرد میں فرق نہیں کیا ہے۔ حالانکہ سورۂ نساء میں دو قسم کی عورتوں کی سزا کا ذکر ہے۔ ایک منکوحہ کنیز، دوسرے غیر منکوحہ شریف خاندانی عورت[1]۔ یہاں سرے سے شادی شدہ آزاد خاندانی عورت کی سزا کا قصہ ہی نہیں۔ وہ ایک الگ درجہ جرم ہے اور اُس کی سزا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح بھی کی اور جاری بھی کی۔

(۲)

اب موقع آیا کہ آپ یہ سوال اُٹھائیں کہ غیر شادی شدہ محصناتِ مومنات اور منکوحہ کنیزوں کی سزا تو سورۂ نور میں آگئی۔ آخر شادی شدہ شریف عورتوں کی دوسری حالتِ احصان کی بنا پر جو سخت ترین

---

[1] سورۂ نساء کی آیت ۲۵ یوں شروع ہوتی ہے کہ وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ …… (تم میں سے جو کوئی استطاعت نہ رکھتا ہو کہ مومن عورتوں میں سے محصنات (محفوظ) کے ساتھ شادی کرے ……" یہاں تک صاف مطلب یہ ہوا کہ مومن عورتیں شادی کرنے سے پہلے بھی ایک قسم کی حالتِ احصان میں ہوتی ہیں۔ اُن کے بالمقابل دوسری طرف غیر خاندانی عورتوں کے متعلق یہ الفاظ آتے ہیں کہ "فَاِذَآ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ" : ترجمہ پھر اگر وہ حالتِ احصان میں آجائیں (یعنی نکاح کرلیں) تو اُن کے لیے سزا نصف ہوگی۔ بات واضح ہے کہ شریف خاندانی عورتوں کی حالتِ احصان مستقل ہے اور مضبوط، بخلاف اس کے نکاح کرنے والی کنیز کو نکاح کی وجہ سے جو حالتِ احصان حاصل ہوتی ہے وہ نسبتاً کمزور نوعیت کی ہے۔ اس فرق کا اثر سزا پر پڑا۔

سزا بیان کی جاتی ہے، وہ قرآن میں کہیں نہیں ہے۔ یہ کیا سلسلہ ہے؟ آخر جو چیز قرآن میں نہیں ہے۔ ہم اُسے کیوں مانیں؟

اس کی وجہ تو ہم بعد میں بیان کریں گے کہ رجم کی سزا کہاں ہے اور مدینے کی سوسائٹی میں کیسے جاری ہوئی، پہلے ایک اور سوال کو حل کر لینا ضروری ہے۔

وہ یہ ہے کہ آپ قرآن یعنی "الکتاب" کو مانتے ہوئے "الرسول" کو اس سے الگ رکھنا چاہتے ہیں اور "الرسول" کوئی بات کہے یا سمجھائے تو آپ اُسے قرآن پر اضافہ یا اس کی مخالفت سمجھتے ہیں۔ بخلاف اس کے "الکتاب" (قرآن) جسے ہم نے "الرسول" ہی کے اعتماد پر اور اس پر ایمان لانے کی وجہ سے برحق اور من جانب اللہ مانا ہے۔ اسی نے ہم سے یہ تسلیم کرایا ہے کہ "الرسول" صرف قاصد نہیں ہے کہ ایک دستاویز پہنچا کر وہ الگ ہو گیا ہو، بلکہ وہ الکتاب نازل کرنے والے ہی کی طرف سے مامور شدہ معلم و مزکی بھی ہے، اسے الکتاب کی "تبیین" (تشریح و توضیح) کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، انہیں ذمہ داریوں کی وجہ سے الکتاب ہی نے بتا دیا کہ وہ جو کچھ کہتا ہے، وحی کے مطابق کہتا ہے۔ اُسے مبعوث کرنے والے خدا نے اپنی اطاعت کا مطالبہ کرنے کے ساتھ (مگر الگ واضح طور پر) اس کی اطاعت کا بھی ہم سے مطالبہ کیا ہے۔ جس طرح اس سے پہلے کے تمام رسول "مطاع" (یعنی واجب الاطاعت) باذن اللہ تھے، اسی طرح آخری "الرسول" بھی مطاع ہے۔ وہ قرآن پر عمل کرنے کا جو طور طریقہ اختیار کرے وہ تمام اہلِ ایمان کے لیے لازمی طور پر اسوہ و نمونہ ہے اور خلقت کے لحاظ سے بشر ہونے کے باوجود تمام آدمیوں کی طرح نہیں ہے کہ جو چاہے کہتا رہے اور جو چاہے کرتا رہے۔ ہم سے کوئی مطلب نہیں۔

الکتاب اس بات کی بھی گواہ ہے کہ الرسول کا کوئی قول و فعل اگر مرضیٔ الٰہی سے ذرا بھی ادھر اُدھر ہوا تو فوراً متوجہ اور متنبہ کر دیا گیا۔ لہٰذا ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی ایسی بات خدا کے رسولؐ کی طرف سے ہوئی ہوتی جو قرآن پر اضافہ ہوتی یا اس سے ٹکراتی یا اس کے منشا کو بدلنے کا باعث بنتی تو ٹھیک اسی طرح الکتاب میں کوئی ایسا کلمۂ گرفت وارد ہوتا جیسے لِمَ تُحَرِّمُ مَا اَحَلَّ اللّٰهُ وارد ہوا ہے، یا جیسے سورہ عبس میں خصوصی توجہ دہانی ہے۔ یا بدر کے قیدیوں کے متعلق وحی جلی میں ایک واضح اشارہ ہے یا جیسے قطعی نہی ہے کہ وَلَا تُصَلِّ اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا

وَلَا تَقُمْ عَلٰی قَبْرِہٖ [1]

صلح حدیبیہ کے موقع پر جب عہد نامے کے آغاز میں بسم اللہ کے آخری الفاظ الرحمٰن الرحیم اور خاتمے پر "رسول اللہ" کے الفاظ کاٹے گئے، پھر عہد نامے کی یہ شرط سامنے آئی کہ قریش کا کوئی شخص اگر اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کے پاس آئے گا تو آپ واپس لوٹا دیں گے مگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا کوئی آدمی اگر قریش کے قابو میں آجائے گا تو وہ واپس نہیں کریں گے، تو مسلمانوں کے خواص و عوام سب کے جذبات میں ہل چل مچ گئی۔ یہاں تک کہ (شرائط طے ہو جانے کے بعد) عین معاہدہ نویسی کے دوران میں ابوجندل بن سہیل قید سے بھاگ کر پابہ زنجیر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر فریادی ہوا۔ قریش کے مطالبے پر اس نوجوان کو حضورؐ نے بادلِ ناخواستہ واپس کرنے کا فیصلہ کیا۔ ورنہ سارا معاہدہ درہم برہم ہو جاتا۔ صحابہ میں اس منظر نے خاموش قسم کا اشتعال پیدا کر دیا اور معاہدے کے بعد جب حضورؐ نے قربانیاں کرنے اور سر منڈانے کا حکم دیا تو کوئی ٹس سے مس نہ ہوا۔ تب حضورؐ نے فرمایا کہ میں خدا کے حکم کا پابند ہوں (او کما قال) اور اس بات کی تصدیق سورۂ فتح سے ہوتی ہے، جس میں اس معاہدے کے متعلق ارشاد ہوا کہ: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا۔ اب فرمائیے کہ سفرِ عمرہ اور صلح حدیبیہ اور شرائطِ معاہدہ کے

---

[1] انبیاء کی عصمت کے دو پہلو ہیں: ایک یہ کہ وہ نفسانیت اور عدمِ اخلاص سے کبھی نہیں سوچتے — دوسرے یہ کہ مفادِ دین ہی کے لیے سوچتے ہوئے اگر معاملہ ایک بال برابر اِدھر اُدھر ہو جائے تو فوراً صریح وحی سے متوجہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے حضرت نوح علیہ السلام کو فرزند کی سفارش پر کیا گیا یا حضرت یونسؑ کو عذاب کے ورود سے قبل (جس کا اشارہ دیا بھی جا چکا تھا۔ مگر ابھی مہلتِ انابت قوم کے لیے باقی تھی) حکمِ الٰہی ملنے سے پہلے مقامِ دعوت کو چھوڑ دینے پر کیا گیا۔ اگر الرسول کو خالص قرآنی مذہبیت کے علمبرداروں کی طرح (نعوذ باللہ) خارج از محفل ہی رکھنا تھا تو پھر متذکرہ اہتمام کی کیا ضرورت تھی۔ انبیاء کا یہ مقامِ معصومیت خود گواہ ہے کہ خدا کی عطا کردہ سند (امتیاز) کے تحت مطاع تھے اور ان کے قول و فعل کو جزوِ دین ہونا چاہیے۔

متعلق قرآن میں کہاں ریکارڈ ملتا ہے - یہ تو صرف الرسول کی بارگاہ سے فراہم ہو رہا ہے۔

اِس مضمون میں زیادہ مثالیں نہیں دی جا سکتیں۔ بس ایک اور! خطبۂ حجۃ الوداع تو آج ایک آج ایک عظیم بین الاقوامی منشورِ حقوق کی حیثیت سے پیش کیا جاتا ہے۔ اس میں کچھ قانونی احکام ہیں، کچھ اصولی ہدایات، کچھ حکیمانہ اشارات۔ اس دستاویز کی کیا حیثیت ہے؟ یہ قرآن پر اضافہ ہے، قرآن سے متعارض ہے؟ کیا یہ فی نفسہٖ قرآن ہے؟ قرآن کی تشریح ہے؟ کیا اس کے موضوعات محض وقتی قسم کے ہیں؟ کیا اسے آپ یہ کہہ کر ناقابلِ اعتنا قرار دے سکتے ہیں کہ یہ چونکہ قرآن سے باہر کی ایک چیز ہے لہٰذا دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں؟ اس کسوٹی پر اپنی منطق کو خوب پرکھ لیں۔

اسی اعلامیے یا دستاویز میں ایک جملہ یہ ہے کہ الولد للفراش وللعاھر الحجر۔ بچے پر حق اس کا جس کے بستر پر (یعنی گھر میں) پیدا ہو، اور زانی کے لیے پتھر۔ یعنی زانی کسی بچے کے متعلق دعوٰی (CLAIM) نہیں کر سکتا کہ یہ میری بدکاری کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا میں اس پر حق رکھتا ہوں، نہیں، وہ اگر زنا کا اقرار کرے گا (یا شرعی طریق سے اس کا جرم ثابت ہو جائے گا) تو اسے پتھر کھانے ہوں گے۔ لیجیے حضورؐ کے آخری وصیتی خطاب میں بھی سزائے رجم کا تذکرہ موجود ہے۔ فرمایئے کہ یہ سارا خطبہ بیٹھ کر گھڑا گیا ہے، نہ حجۃ الوداع ہوا، نہ کوئی وداعی خطبہ تھا۔ نہ اس میں فلاں بات تھی بلکہ عجمی سازش نے ایک اور ڈرامہ گھڑ دیا ہے۔ تو پھر جناب والا کی یہ ذمہ داری ہے کہ مثلاً خاص حجۃ الوداع اور خطبۂ حجۃ الوداع کے بارے میں تاریخی طور پر ثابت کریں کہ فلاں تاریخ کو فلاں جگہ فلاں فلاں اصحاب نے اسے مل کر گھڑا تھا۔ مگر شرط ہے کہ ایسے دعوے پر تاریخ سے حوالہ بہ حوالہ شہادتیں دینی ہوں گی کہ آپ جو کچھ فرما رہے ہیں، معاصرانہ تاریخ اور ادب کا ریکارڈ اس پر گواہ ہے۔ اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے بلکہ گول مول باتوں (SWEAPING REMARKS) کا جھاڑو دینی ریکارڈ کے ساتھ ساتھ تاریخ و ادب پر بھی پھیر دینا چاہتے ہیں۔ تو کوئی پورا مخالفِ تصورِ دین یہ کہہ سکتا ہے کہ قرآن اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا جتنا بھی ریکارڈ سامنے ہے وہ سارے کا سارا کسی نے (نعوذ باللہ) عجمی سازش بلکہ مذہب پرستانہ سازش کے تحت گھڑ دیا ہے۔

جن صحابہؓ نے قرآن کو لکھا، یاد کیا اور روایت کیا ہے، انہی نے حضورؐ کی طرف سے اس کی قولی اور عملی تبیین و تشریح کو بھی لکھا، یاد رکھا اور روایت کیا ہے۔ جو صحابہؓ قرآن کو واجب الاطاعت

قرار دیتے ہیں۔ وہی قرآن اور رسولؐ کے حوالے سے رسولِ خدا کے ارشادات اور اقدامات کی پیروی کو بھی لازم ٹھہراتے ہیں۔ وہ اگر اُدھر سچے ہیں تو اِدھر بھی سچے ہیں۔

آپ کے بالمقابل محدثین کا گروہ ہے جو کسی بھی روایت کو اوّلاً اس کے سلسلۂ روایت کے لحاظ سے پرکھتے ہیں، متعدد سلسلہ ہائے اسناد ہوں تو اُن کا تقابل کرتے ہیں۔ مفہوم کے لحاظ سے بھی ایک طرف قرآن سے تطبیق دیتے ہیں۔ دوسری طرف آنحضورؐ کے مجموعی فرمودات اور سیرت اور ذوق کے فریم میں رکھ کر دیکھتے دکھاتے ہیں۔ پھر واقعاتی تاریخ سے شہادتیں لیتے ہیں۔ اس اہتمام کے ساتھ وہ کسی سنّت کو سامنے لاتے ہیں۔ دوسری طرف آپ ہیں کہ آپ بھرپور سازش کا خوفناک دعویٰ تو کرتے ہیں مگر دینی اور تاریخی حیثیت سے اس کا کوئی ثبوت فراہم نہیں کرتے۔ "میں نہ مانوں" کا طریقہ دین یا علم یا تاریخ کے میدانوں میں چل نہیں سکتا۔

اور پھر آپ جو یہ کہتے ہیں کہ صرف قرآن کی بات درکار ہے اور کوئی نہ بولے۔ اس سنسر کا اطلاق آپ رسولِ خدا صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ہستی تک پر کرنے کی گستاخی تو فرماتے ہیں، مگر خود قرآن کے نکات و اسرار کی وضاحت اور آیات کے مفہوم و منطوق کی صراحت من مانے طریق سے کرنے کے لیے کتابوں پر کتابیں اور رسالوں پر رسالے لکھتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی آپ کے خود ساختہ تصوّرِ دین کے تحت جس دائرے میں خدا کی سند اور معصومیت رکھنے والے پیغمبر کو بولنے کا حق نہیں، اُس دائرے میں آپ معلّمی اور تفسیر و تبیین کی مسند بچھا کر بیٹھتے ہیں اور بحثیں فرماتے ہیں۔ آپ لوگ سچے ہیں تو اپنے اُصول کے مطابق قرآن کا متن پڑھنے سنانے اور لکھنے کے علاوہ قرآن اور دین کے متعلق آپ کو اپنی زبان بند رکھنی چاہیے، قلم کی حرکت کو روکنا چاہیے اور اپنے لکھے اور چھپوائے ہوئے اوراق کو آگ لگا دینی چاہیے[1]۔ پھر پکاریئے کہ "حَسْبُنَا

---

[1] کوئی نامعلوم ہستی ہیں، جن کی کتاب چھپی ہے مگر سوائے نام کے اور کوئی تعارف درج نہیں، یعنی اسم معلوم مسمیٰ نامعلوم۔ جو کوئی صاحب بھی ہیں ایک انگریزی کتاب احمد نواز کے نام سے ہمارے سامنے ہے عنوان ہے "آزادی برائے قرآن" (FREEDOM FOR QURAN) اس میں ایک باب کا عنوان ہے "کتابوں کے پہاڑ" اور پھر اس وضع کردہ ترکیب کو جگہ جگہ سورۂ جمعہ کی آیت کا غلط اطلاق کر کے استعمال کیا ہے، جیسے یہ اُن کا ایک "سلوگن" ہو۔ متذکرہ باب میں وہ "مثلثِ کذب" کا ذکر فرماتے ہیں (باقی بر صفحہ آئندہ)

کتاب اللہ" مگر افسوس کہ خود یہ جملہ بھی قرآن میں موجود نہیں۔ جس سرچشمے سے آپ یہ جملہ لیتے ہیں اس سے اور باتیں کیوں نہیں لیتے؟ آخر یہ جملہ بھی سازش کا حصہ کیوں نہیں ہے؟

غلط موقف کا آدمی دسیوں قسم کی اُلجھنیں پیدا کر کے خود ہی اُن میں پھنس جاتا ہے۔ مگر ہائے ری ہٹ اور ہٹ بھی کیسی مقدس؟ "قرآن ہٹ"! بدقسمتی سے ایسی قرآن ہٹ قرآن سے ہٹا ہی لے جاتی ہے۔ رسول کو چھوڑا تو قرآن بھی گیا۔

"بہ مصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست۔ اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی ست"

اس "ماڈرن سازش" کا قصہ یہیں چھوڑ کر اب ہم از سر نو سزائے رجم کی طرف آتے ہیں۔

جیسے کہ عرض کر چکے ہیں کسی جرم کی عمومی اور اوسط شناعت کے ساتھ ساتھ اس کے مختلف مدارج کا بھی لحاظ ضروری ہے۔ شریعت میں یہ لحاظ موجود ہے۔

رجم کی حد نہایت ہی غیر معمولی اور نادر الوقوع صورتوں میں نافذ کی جاتی ہیں۔ اگر لوگ از خود اقرار جرم نہ کر لیں تو شاید مہینوں یا برسوں میں کوئی قابل گرفت وقوعہ عدالت میں نہ آئے۔ کوئی ایسا شخص جو نکاح کی

(حاشیہ صفحہ سابقہ) جس کے تین منبعے ہیں: "احادیث، تفاسیر اور سیرت"۔ مصیبت تو یہ ہے کہ اس ریکارڈ کو دریا برد کیے بغیر لوگوں کی توجہ "الرسول" سے نہیں ہٹتی اور قرآن کی من مانی ماڈرن توضیحات نہیں کی جا سکتیں۔ ورنہ فی نفسہ قرآن و دین سے تعلق رکھنے والی کتابوں کا (بلا استثناء) اگر وجود ہی ناقابلِ برداشت تھا تو پھر خود آنجناب نے کیوں دین کا اپنا ایک تصور پیش کیا ہے اور قرآن کے مختلف حصوں کی تفسیر کی ہے۔ احمد نواز صاحب کا مقصد یہ ہے کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم اور اصحاب اور جملہ علمائے سلف سے پہنچنے والی ہر دینی بات کو تو "مثلث کذب" کے گڑھے میں ڈال دو، اور میری کتاب کو سینے سے لگا لو۔ اس کے بغیر تم قرآن اور دین کو نہیں سمجھ سکو گے۔ یہ گویا رسول اللہ کے خدا کے عطا کردہ متعدد مناصب ـــــ معلم، مزکّی، مفسرِ قرآن، داعی حکمت قائد تحریک اسلامی، اسوہ و نمونہ بر لئے امت ـــــ سے ہٹا کر خود اُن پر قبضہ جمانا ہے۔ ایک نئی نبوت کا اعلان کرنے کے بجائے دین کو نئے نقشے پر ڈھال دینے کے لیے یہ چال لطیف تر ہے۔ مگر وہ سوال پھر رہ جاتا ہے کہ آپ نے کتابوں کے پہاڑ میں ایک اور انسانی کتاب کا اضافہ کیوں کیا؟

حفاظت کی پروا کرتا ہے، نہ مجرم کے اخفاء کا اتنا اہتمام کرتا ہے کہ کم سے کم چار گواہ تو اُسے عین عروجِ فعل (CLIMAX) کی حالت میں نہ دیکھنے پائیں تو اول تو ایسا آدمی اور اس کا جرم کبھی کبھار ہی معاشرے کی قانونی گرفت میں آسکتا ہے۔ دوسرے ایسا شخص انسانیت کے کم سے کم تقاضوں کے دائرے سے خارج ہو کر وحشیانہ اور حیوانی اسفلیت کے مقام پر جا گرتا ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ ایسے بہیمانہ معاملات میں "شائستگی" مجرم کی سفارشی بن کے آکھڑی ہو۔

ایسے شاذ و نادر وقوعوں کے لیے رسولِ برحق صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے سے موجود "الکتاب" کے ایک معروف و معلوم حکم کو لے لیا اور نافذ کر دیا۔ پھر اُسی کی تعلیم دی[1]۔

اب اگر کوئی شخص قرآن کو رسولؐ سے جدا کرلے تو وہ تو نماز کی کوئی ترتیب تک مقرر نہیں کرسکتا روزے کے بے شمار ضروری احکام کو نہیں جان سکتا۔ دیگر ازدواجی اور کاروباری اور سماجی معاملات میں قطعی ضابطے نہیں بنا سکتا۔ بہت سی اصطلاحات کا تو وہ محض ایک فلسفیانہ ہیولیٰ گھڑ سکتا ہے، اور ایسے امور میں اُمت بننا اور ریاست قائم کرنا تو کجا دو آدمی بھی متفق نہیں ہو سکتے۔ انکارِ حدیث افتراق کا راستہ ہے، بلکہ تاراج کا!

---

[1] قاعدہ یہ ہے کہ مذاہبِ ماسبق کی کتب کے مندرجات یا جاہلی مذہبی و سماجی رسوم میں سے بعض اجزاء کو قرآن یا رسول اللہؐ نے منسوخ کیا، بعض کی اصلاح کی اور بعض صحیح چیزوں کو جوں کا توں لے لیا۔ اگر کتبِ سابقہ کے محفوظ حصوں میں کوئی بات خدا کی وحی کردہ تھی اور اُسے تبدیل و منسوخ کرنے کا حکم نہیں آیا یا کوئی متبادل صورت خدا کے نبیؐ نے متعین نہیں بلکہ اُسی پہلی بات کو جاری فرما دیا تو وہ بھی شریعت کا جزو ہو گئی۔ نمازوں، حج، عمرہ، قربانی اور کئی دوسرے مسائل میں سابق شریعتوں کے حقیقی احکام کی یا تو تجدید کی گئی یا اُن میں ترمیم۔ آخر آنحضورؐ کو تو علم دیا گیا تھا کہ کس معاملے میں کس پیغمبر کا حکم کیا اور اس کی اُمت کا معمول کیا تھا۔ خود زانی محصن کا جو مقدمہ یہودیوں کی طرف سے آیا تھا۔ اُس میں آپؐ نے تورات کے مطابق فیصلہ کیا اور یہودیوں نے متعلقہ آیت کو چھپانے کی کوشش کی، مگر حضورؐ نے اُن کے مکر کا قلع قمع کر دیا۔ ظاہر ہے کہ اس مقدمے کے دوران میں حضورؐ اور صحابہؓ کے درمیان بار بار گفتگوئیں ہوئی ہوں گی، جن میں آپؐ نے سزائے رجم کو خدائی قانون اور کتاب اللہ (تورات) کی آیت قرار دیا۔

اِدارہ ترجمانُ القرآن کی نئی پیشکش

جنابِ محمّد صلاحُ الدّین صاحب مدیر "جسارت"

کے قلم سے

بُنیادی حقوق

پیش لفظ

مولانا سیّد ابُو الاعلیٰ مودُودی

حرفِ آغاز

مُحمّد صلاحُ الدّین

○

کاغذ ولایتی — طباعت آفسٹ — کور خوبصورت

سائز ۱۸×۲۲/۸

○

قیمت: بیس۲۰ روپے

○

اِدارہ ترجمانُ القرآن۔ اِچھرہ۔ لاہور

جولائی ۱۹۸۱ء
رجسٹرڈ ایل نمبر ۵۳۴۴